طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

نمود

شمارہ ۵، ۲۰۱۶ء

مدیران

وکش اویس، اسداللہ خان

LUMS

گرمانی مرکزِ زبان و ادب

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور، پاکستان

NUMŪD

Annual Students' Magazine

Volume 5, 2016

LUMS

Gurmani Centre for Languages and Literature
Lahore University of Management Sciences
Opposite Sector 'U' DHA Lahore Cantt 54792, Pakistan
UAN: +92-42-111-115-867 Email: numud@lums.edu.pk

فہرست

اداریہ

مضامین

''لمز'' کے طلبہ کے نام	جواد ایس خواجہ		۷
زندہ انسانوں کا کفن: منشی پریم چند کے افسانے ''کفن'' کا تنقیدی جائزہ	محمد عمر حبیب	(طالب علم لمز)	۹
افسانہ ''کچرا بابا'' کے کچھ پہلو میری نظر میں	پریا فاطمہ سجاد	(طالب علم لمز)	۱۷
منٹو کا ''یزید'' میری نظر میں	عثمان ابراہیم	(طالب علم لمز)	۲۰
ن م راشد: ایک مختصر مطالعہ	وکش اویس	(طالب علم لمز)	۲۳
غالبؔ کا صوفیانہ انداز	عبدالوہاب نیاز	(طالب علم لمز)	۳۰
''کئی چاند تھے سرِ آسمان'' کی تاریخی پس منظر میں اہمیت	وقار سپرا		۳۵
پاکستان کا مطلب صرف لا الہ الا اللہ؟	عمیر احمد	(طالب علم لمز)	۴۱

افسانہ / تخلیقی نثر

بھوک	محمد عمر حبیب	(طالب علم لمز)	۴۴
تلاش	فضا عارف	(طالب علم لمز)	۵۴
اپنے اپنے طوفان	عائشہ شبیر	(طالب علم لمز)	۶۴

انٹرویو

شمس الرحمٰن فاروقی	محمد عاکف رمضان/ ملک محمد دانش	(طلبہ لمز)	۶۸

ترجمہ

کچھ کتابوں اور کتاب خانوں کے بارے میں [پاؤلو کوئیلہو (Paulo Coelho) کے ایک اقتباس کا اردو ترجمہ]	ترجمہ: محمد عاطف رشید ملک	(طالب علم لمز)	۸۱

شاعری

نظم ''پہلی نظر میں محبت'' جان کلیئر کی نظم ''First Love'' سے ماخوذ	ریشم الیاس ڈار	(طالب علم لمز)	۸۴
غنی خان کی پشتو نظم سے ماخوذ	محمد خان	(طالب علم لمز)	۸۶
غزل	وکش اویس	(طالب علم لمز)	۹۰
میں اس کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں	اسد اللہ خان	(طالب علم لمز)	۹۱

انگریزی مضامین

Ustaad Daaman aur Faiz Ahmed Faiz	Shahama Sajid	(Student / LUMS)	3

اداریہ

گرمانی مرکزِ زبان وادب، لمز کے تحت شائع ہونے والے سالانہ مجلّے نمود کا پانچواں شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ نمود کو ادبی رسائل میں یہ مقام حاصل ہے کہ اس میں، طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے، ان ہی کی تحریروں پر مبنی مضامین، افسانے اور تخلیقی نثر شائع کی جاتی ہے۔

نمود کے حالیہ شمارے میں جسٹس (ریٹائرڈ) جواد ایس خواجہ صاحب کی طرف سے جو آج کل لمز کی فیکلٹی میں شامل ہیں، ''لمز کے طلبہ کے نام'' سے ایک تحریر شامل ہے، جس میں انھوں نے لمز کے طلبہ کی اردو زبان میں بڑھتی ہوئی دلچسپی اور طلبہ کی تحریروں پر مشتمل مجلّہ نمود کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ عصرِ حاضر کے نامور ادیب اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی لمز کے طلبہ کے ساتھ ایک غیر رسمی گفتگو بھی تحریری شکل میں شامل ہے۔ ان دونوں اصحاب کی تحریروں کی بدولت یہ شمارہ انفرادیت کا حامل ہے۔

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ نمود میں شامل تمام تحریریں لمز کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ نے لکھی ہیں۔ یہ تمام طلبہ مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں، جن کی تحریریں نمود کی زینت بنی ہیں۔

اب کچھ ایسے لوگوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جن کی معاونت اور ذاتی دلچسپی کے بغیر یہ شمارہ شاید تکمیل کے مراحل طے نہ کر پاتا۔ سب سے پہلے گرمانی مرکز کی ڈائریکٹر محترمہ یاسمین حمید صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے اور گرمانی مرکز کے استاد احمد بلال صاحب بھی خاص شکریے کے مستحق ہیں جن کی نگرانی میں یہ رسالہ تیار ہوا اور گرمانی مرکز کے ریسرچ ایسوسی ایٹ جناب ذیشان دانش بھی اس مرحلے میں شریکِ کار رہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ نمود کا یہ شمارہ آپ پسند کریں گے اور رسالے کی بہتری کے لیے اپنی آرا اور تجاویز سے ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

مدیران

جواد ایس خواجہ

''لمز'' کے طلبہ کے نام

اعلیٰ عدلیہ کے ایک جج اور پھر عدالتِ عظمیٰ کے سربراہ کی حیثیت سے مجھے اکثر یہ احساس شدت سے ہوتا رہا کہ کئی دہائیوں (decades) کی سخت محنت اور کئی بے نوا نسلوں کی کاوشوں کے باوجود آج بھی انگریزی ہمارے ہاں بہت ہی کم لوگوں کی زباں ہے۔اور اکثر فاضل وکلا اور جج صاحبان بھی اس میں اتنی مہارت نہیں رکھتے جتنی کہ درکار ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ آئین اور قانون کے نسبتاً سادہ نکتے بھی انتہائی مشکل اور ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں۔ ہمارا آئین پاکستان کے عوام کی اس خواہش کا عکاس ہے کہ وہ خود پر لاگو قانونی ضوابط اور اپنے آئینی حقوق کے بارے میں صادر کیے گئے فیصلوں کو براہِ راست سمجھنا چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ حکمران جب اُن سے مخاطب ہوں تو ایک پرائی زبان میں نہیں بلکہ قومی یا صوبائی زبان میں اُن سے گفتگو کریں۔ یہ نہ صرف اُن کی عزتِ نفس کا تقاضا ہے بلکہ اُن کے بنیادی حقوق میں شامل ہے اور دستور (constitution) کا بھی منشا یہی ہے۔ایک غیر ملکی زبان میں لوگوں پر حکم صادر کرنا محض اتفاق نہیں بلکہ یہ سامراجیت (imperialism) کا ایک پرانا اور آزمودہ (tested) نسخہ ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یورپ میں ایک عرصے تک کلیسائی عدالتوں (ecclesiastical courts) کا راج رہا جہاں قانون کا بیان اور تشریح صرف لاطینی (Latin) زبان میں ہوتی تھی جو راہبوں (clergy) اور شہزادوں کے سوا کسی کی زبان نہیں تھی۔ یہاں برِصغیر پاک و ہند میں آریائی عہد میں حکمران طبقے نے قانون کو سنسکرت کے حصار میں قید کر دیا تھا تا کہ برہمنوں، شاستریوں اور پنڈتوں کے سوا کسی کے پلے کچھ نہ پڑے۔اس کے بعد ایک عرصے تک فارسی غالب رہی جو بادشاہوں، قاضیوں، عالموں اور رئیسوں کی زبان تو تھی لیکن عوام کی زبان نہ تھی۔انگریزوں کے

غلبے کے بعد لارڈ مکاؤلے کی تہذیب دشمن سوچ کے زیرِ سایہ ہماری مقامی اور قومی زبانوں کی تحقیر کا ایک نیا باب شروع ہوا جو بدقسمتی سے اب بھی جاری ہے۔ اور جس کے نتیجے میں ایک طبقاتی تفریق (class division) نے جنم لیا جس نے ایک قلیل لیکن طاقت ور اور غالب (dominant) اقلیت (minority)، جو انگریزی جانتی ہے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے، اور جس نے عوام الناس کے درمیان وسیع دُوریاں اور فاصلے حائل کر دیے ہیں جو کسی طور قومی اتفاق و یکجہتی کے لیے فائدہ مند نہیں۔ آئینِ پاکستان البتہ ہمارے عوام کے سیاسی اور تہذیبی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے، جنھوں نے آرٹیکل ۲۵۱ اور آرٹیکل ۲۸ میں محکومانہ سوچ کو خیر آباد کہہ دیا ہے اور حکمرانوں کو بھی تحکمانہ (commanding) رسم و رواج ترک کر کے عوامی خدمت اپنانے کا سبق دیا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ ''لمز'' کے طلبہ اُردو زبان میں دلچسپی لے رہے ہیں جس کا ثبوت گرمانی مرکزِ زبان و ادب کے تحت پیش کیے جانے والے کورسز میں اُن کی پُرجوش شرکت سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ گرمانی مرکزِ زبان و ادب کے تحت ''لمز'' کے طلبہ کی اُردو تحریروں پر مشتمل مجلّہ ''نمود'' بھی اس کا واضح ثبوت ہے۔ کوئی بھی قوم اپنی قومی زبان سے الگ اور لاتعلق ہو کر حقیقی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتی۔ دیگر عالمی ترقی یافتہ زبانوں پر دسترس رکھنا وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن ایسا ہرگز اپنی زبان کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی ثقافت و قومی اقدار سے لاتعلقی ذہنی طور پر غلام قوموں کا شیوہ ہے لیکن وقت بدل رہا ہے اور لمز کے طلبہ سے مل کر اور گفتگو کر کے میں پُراُمید ہوں کہ یہاں سے وہ کارواں نکلے گا جو اس قوم کو ان پستیوں سے نکال کر عروج اور بلندی کی جانب گامزن کرے گا۔

آئینِ جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

(جسٹس (ریٹائرڈ) جواد ایس خواجہ، لمز میں استاد ہیں)

محمد عمر حبیب

زندہ انسانوں کا کفن: منشی پریم چند کے افسانے ''کفن'' کا تنقیدی جائزہ

منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' بنیادی طور پر ''ترقی پسند تحریک'' کے منشور کی نمائندہ تحریر ہے۔ اِس سے قبل افسانوی نثر میں ترقی پسند رجحان کے اثرات خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ بجا طور پر ''کفن'' کو ہی یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ترقی پسند نظریے کی عکاسی کرنے والا پہلا مکمل اور جامع افسانہ ہے جو نہ صرف فکری لحاظ سے، بلکہ فنی اعتبار سے بھی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ منشی پریم چند کا لڑکپن انتہائی نامساعد حالات میں گزرا، غربت و افلاس نے ان کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، جس کے اثرات ان کے افسانوں میں بھی جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا اور انھوں نے لکھنے کا آغاز اسی نام سے کیا تھا مگر جب ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے کو انگریز سرکار نے اس وجہ سے نذرِ آتش کیا کہ اس میں حکومت کے خلاف باغیانہ نظریات پائے گئے تھے تو دھنپت رائے نے قلمی نام پریم چند اختیار کیا اور اخیر عمر تک اسی نام سے لکھتے رہے۔ انھوں نے عام انسان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور پھر اس کے مسائل کو جس انداز میں سپردِ قلم کیا وہ لائق تحسین ہے۔ مذہب کے لحاظ سے ہندو تھے مگر ہندو معاشرے میں رائج قبیح رسوم و رواج کے سخت ناقد تھے۔ اُن کا افسانہ ''کفن'' نہ صرف رسوم و رواج سے بغاوت کا اظہار ہے، بلکہ سماج کے اہل ثروت افراد کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ بھی ہے۔ اِس افسانے میں جس المیے کا ذکر ہے وہ بے حسی اور بے بسی کی درمیانی حالت ہے۔ پورا افسانہ دو کرداروں مادھو (بیٹا) اور گھیسو (باپ) کے گرد گھومتا ہے۔ یہ دونوں بے حد کاہل ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر انھیں رزق مل جائے۔ مادھو کی بیوی بدھیا کی موت

افسانے کی بنیاد بنی ۔ بدھیا دردِ زہ کی شدت سے تڑپ رہی ہے مگر مادھو اور گھیسو باہر بیٹھے آلو بھون کر کھانے میں مشغول ہیں، اس دوران وہ وقتاً فوقتاً بدھیا کی تکلیف پر تبصرہ بھی کرتے رہتے ہیں مگر مجال ہے کہ اُن میں سے کوئی بدھیا کو حوصلہ دینے کے لیے ہی اندر چلا جائے۔ آلو کھانے کے بعد وہ لمبی تان کر سو جاتے ہیں اور جب صبح اٹھتے ہیں تو بدھیا کو مردہ پاتے ہیں۔ افسانہ اس وقت آگے بڑھتا ہے جب اہل علاقہ بدھیا کے کفن دفن کے لیے امداد دیتے ہیں اور باپ بیٹا شہر جا کر وہ سب پیسے مے خانے میں اڑا دیتے ہیں۔

اِس افسانے کا عنوان ''کفن'' انسان کی مادی ضروریات کا استعارہ ہے۔ کفن محض دو گز کپڑے کے اس ٹکڑے کو نہیں کہتے جو مردے کو پہنا کر اسے دفنایا یا جلایا جاتا ہے، بلکہ یہ تو اُن تمام زندہ انسانوں کی ضرورت کا نام ہے جنھیں اپنا تن ڈھانپنے کے لیے لباس اور بھوک مٹانے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور اِس کفن کی ضرورت صرف مادھو یا گھیسو کو نہ تھی بلکہ بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والا ہر زندہ فرد اِسی کفن کا محتاج ہے۔ مادھو اور گھیسو کو زندہ رہنے کا اسباب چاہیے، سو وہ بدھیا کے کفن کو چھوڑ کر اپنے کفن کا بندوبست کرنے لگتے ہیں کیونکہ بہر طور زندہ انسان کی اہمیت بے جان لاش سے زیادہ ہے۔ ذرا ان کی وہ درد بھری کیفیت تو دیکھیے جو بدھیا کی موت کے بعد چند روپے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔''

''کپھن لاش کے ساتھ جل تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے، یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

مادھو، گھیسو، بدھیا، زمیندار، فقیر اور محنت کش کسان خیالی کردار نہیں ہیں بلکہ یہ تقریباً ہر معاشرے کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ اُن کا ہر عمل ان کی مجبوری تھی، جو انھوں نے وقت کے تقاضے کے تحت کیا۔ بلاشبہ یہ کردار پورے انسانی طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ منشی پریم چند نے حقیقت نگاری اس انداز میں کی ہے کہ حقائق بیان کرنے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیا بلکہ انسانوں کو ایک آئینہ دکھایا ہے۔

''کفن''، فنی لحاظ سے بھی ایک ادبی شاہکار ہے جس میں منظر نگاری سے لے کر مکالمہ نویسی تک ہر فن کا کمال

استعمال کیا گیا ہے۔ جملوں میں طنز بہت نمایاں ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ مادھو اور گھیسو بدھیا کے کفن کے پیسے ہڑپ کرنے کے بعد بدھیا کو کن الفاظ میں یاد کرتے ہیں:

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ''ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی آسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں نہانے جاتے ہیں اور مندر جل چڑھاتے ہیں۔''

اِس اقتباس کا ایک ایک حرف موجودہ معاشرے کے لیے نشتر کی مانند ہے۔ مادھو اور گھیسو کے پاس مال و متاع یا ایسی کوئی طاقت نہ تھی کہ کسی خیر خواہ کو نوازتے اور بدخواہ کا جینا دوبھر کر دیتے۔ وہ کسی کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے تو اُس کی عدم موجودگی میں بھی اُس کی اچھائی بیان کر بیٹھتے یا کسی برے سے پالا پڑتا تو گالیاں دے کر بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔ اِس وقت بھی اُنھوں نے یہی کیا تھا، سرمایہ داروں کے دوغلے رویے پر ان کی تنقید حقائق پر مبنی ہے۔

''کفن'' کا ایک اور اہم پہلو اس کے واقعات میں تسلسل اور کہانی کے بہاؤ میں ربط ہے۔ مکمل کہانی کے کسی ایک بھی واقعے یا مکالمے میں جھول دکھائی نہیں دیتا۔ الفاظ میں اس قدر جامعیت ہے کہ ہر جملہ ایک مکمل مضمون رکھتا ہے۔ خصوصاً جس انداز میں منظر نگاری کی گئی ہے، چند جملوں نے بہت گہرا مفہوم ادا کیا ہے۔ مصنف نے افسانے میں جا بجا بالواسطہ طور پر ایسی کئی باتوں کا ذکر کر دیا جن کا ذکر ضروری تھا مگر شاید تفصیلات بتانے سے قاری بور ہو جاتا۔ طلسمِ ہوش ربا کے اسیر منشی پریم چند کو جہاں چھوٹے سے واقعے کو کھل کر بیان کرنے کا فن آتا ہے، وہیں ایسے انداز میں دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پوریاں کھانے کے بعد جب جذبات سے سرشار مادھو نے بچی ہوئی پوریاں بھکاری کو دیں، وہ منظر بھی نرالا تھا۔

''کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی

طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دینے کا غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا تھا۔‘‘

امیر اور غریب کے مابین فرق مصنف نے صرف ایک جملے میں سمجھا دیا ہے۔ سرمایہ دار دھن جوڑنے میں لگا رہتا ہے اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ چہ جائیکہ اس کا مال ضائع ہو جائے مگر کوئی غریب استفادہ نہ کر سکے۔ مگر دوسری جانب غریب کی سوچ دیکھیے کہ اس کے پاس جو کھانا وافر ہے، وہ اسے لٹا دیتا ہے۔

افسانہ پڑھتے ہوئے جہاں مادھو اور گھیسو کی بے حسی واضح ہوتی ہے، وہاں یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ یہ بے حسی ان کی فطرت میں ہرگز موجود نہیں ہے بلکہ یہ تو معاشرے سے ان کے اندر منتقل ہوئی ہے۔ افسانے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ادراک ہوتا ہے کہ مادھو کی نسبت گھیسو زیادہ بے حس ہے۔ اور صرف زیادہ بے حس ہی نہیں بلکہ زیرک اور معاملہ و موقع شناس بھی ہے۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ مادھو جذبات سے مغلوب ہو گیا مگر گھیسو کے انداز میں ایسی بے نیازی اور سرد مہری ہے کہ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا گمان ہوتا ہے۔ مادھو کے جذباتی ہونے کی ایک ممکنہ وجہ اُس کی بدھیا سے قلبی وابستگی بھی ہو سکتی ہے لیکن بہرحال سب سے اہم وجہ اس کا ابھی پختہ کار نہ ہونا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ لوگ بدھیا کے بیکنٹھ جانے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں تو مادھو یکا یک پریشان ہو جاتا ہے۔

’’کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔‘‘

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

’’جو وہاں ہم سے پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے۔؟‘‘

’’کہیں گے تمھارا سر۔‘‘

’’پوچھے گی تو جرور۔‘‘

’’تُو کیسے جانتا ہے کہ اسے کپھن نہ ملے گا، تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔۔۔۔ وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کے دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پیئیں گے اور

کپھن تیسری بار ملے گا۔''

اِسی طرح افسانے کے آخر میں مادھوا سے یاد کر کے رونے لگتا ہے۔ اُس وقت بھی گھیسو ہی اسے سمجھاتا ہے کہ بدھیا کا مرنا ہی اُس کے حق میں بہتر تھا۔ افسانہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ انسان ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ مزید زیرک اور تجربہ کار ہوتا چلا جاتا ہے اور گردشِ حالات انسان کو جذباتی طور پر حیوان سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ معاشرے کی مجموعی بے حسی اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب ایک طرف بدھیا درد زہ سے چلا رہی ہوتی ہے تو اہلِ محلّہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مگر دوسری جانب اس کے مرنے پر مادھو اور گھیسو کے رونے کی آواز سن کر پڑوسی دوڑے چلے آتے ہیں۔ یہ رویہ نہ صرف انسانی فطرت میں تضاد کو نمایاں کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ زندہ انسان کو نظر انداز کرنے کے المیے کو بھی عیاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

افسانے میں بھوک اور افلاس کے نتائج کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ بھوک تہذیب کے آداب بھلانے کے ساتھ ساتھ انسان کو اُس کے مذہب سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔ اِسی طرح جب بدھیا تکلیف میں تھی تو مادھو اس کے جلدی مرنے کی دعا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اِس وجہ سے بدھیا کو دیکھنے نہیں جاتا کہ خدانخواستہ اُس کا باپ سارے آلو نہ ہڑپ کر جائے۔ اُن کے مابین اُس موقعے پر ہونے والا مکالمہ قابلِ ذکر ہے۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا، جا دیکھ تو آ۔''

مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آ ؤں۔''

''تو بڑا بے درد ہے بے، سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا، اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔''

''تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھنساؤ ہو گا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

کس طرح بھوک انسان کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے، یہ مکالمہ اسی سوال کا جواب ہے۔علاوہ ازیں انسان کا دکھ اس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ پُرتعیش دنوں کو یاد کرتا ہے۔پوریاں کھانے کے لیے مادھو سے زیادہ گھیسو بے قرار ہے حال آنکہ وہ پہلے بھی اس نعمت سے استفادہ کر چکا ہے۔لیکن ٹھاکر کی شادی کے کھانے کی یاد اُس کی بھوک کو مزید بھڑکا رہی ہے۔اگر ہم اس افسانے میں گھیسو اور مادھو کی جگہ خود کو تصور کریں تو یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہم بھی ایسی صورتحال میں اُس کے سوا اور کچھ نہ کرتے جو انھوں نے کیا۔دراصل ہم ایسی جسارت سے اس وجہ سے باز رہتے ہیں کہ ہمیں دنیا والوں کی ملامت کا خوف لاحق ہوتا ہے مگر وہ دونوں ان مراحل کو بہت پہلے عبور کر چکے تھے۔جب انسان معاشرے کے بندھن اور مذہبی رسوم سے ہی بے گانہ ہو جائے تو اس کا عمل ان دو کرداروں سے قطعی مختلف نہ ہوگا۔

افسانے میں معاشرے کے دو طبقات کا تذکرہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ان میں سے پہلا طبقہ تہی دماغ کسانوں کی جماعت ہے جب کہ دوسرا گروہ فتنہ پرداز جماعت ہے۔ تہی دماغ جمعیت کی اصطلاح کسانوں اور کاشتکاروں کے لیے استعمال ہوئی ہے کیونکہ یہ وہ طبقہ ہے جو دن بھر جاگیردار کے حکم پر کولھو کے بیل کی طرح کام کرتا ہے مگر معاشی آسودگی حاصل نہیں کر پاتا۔فتنہ پرداز جماعت سے وہ حکمران طبقہ مراد ہے جو ہاتھ پیر تک نہیں ہلاتا مگر اس طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی عقل کے بل بوتے پر محنت کش لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور مفت میں پیسہ پاتے ہیں۔اس معاشی ناہمواری کے سبب محنت کش غریب مزدور کو کچھ خاص حاصل نہیں ہو پاتا۔دیکھیے مصنف نے یہ بات کس انداز میں لکھی ہے۔

کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ہم کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہوگیا۔ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرے۔اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔مگر پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم

کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

اس اقتباس میں ایک اصطلاح ''شاطروں کا آئین'' استعمال ہوئی ہے۔ شاطر جاگیرداروں کا آئین دولت و جاگیر کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کوئی شخص دولت منداور سرمایہ دار ہے تو شاطر اس کو اپنی جماعت میں بخوشی قبول کر لیتے ہیں مگر ان کے ڈھب پر زندگی بسر کرنے والے غریب کا ان کے نزدیک ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مادھو اور گھیسو کی فطرت بھی ان وڈیروں اور زمینداروں سے ملتی تھی، جو کام سے جی چراتے ہیں اور دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالا کرتے ہیں۔ یہ دونوں بھی دوسروں کے کھیتوں سے سبزیاں چوری کر کے اپنا پیٹ بھرتے۔ مصنف دراصل یہاں پر معاشرے کی معاشی ناہمواری پر بھی تنقید کرتا نظر آتا ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام سے وہی لوگ مستفید ہوتے ہیں جن کے پاس دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ لوگ غریب کا زندہ رہنا محال کر دیتے ہیں۔ یہی بات ترقی پسند تحریک کے نظریے کی اساس ہے، کیونکہ ترقی پسند تحریک انسانی معاشرے میں چندافراد کی اجارہ داری کے خلاف ایک آواز تھی جو بیشتر ملکی وسائل پر بلاشرکتِ غیرے قابض تھے۔

افسانے کا پلاٹ نقائص سے پاک ہے مگر چند ایک واقعات میں ایسا تضاد دیکھنے کو ملتا ہے جو حالات سے میل نہیں کھاتا۔ مصنف نے افسانے کے ابتدائی حصے میں جو منظر کشی کی ہے، اس کے مطابق غربت اس قدر ہے کہ شدید سردیوں میں بھی الاؤ بجھا ہوا ہے مگر بعد ازاں مادھو اور گھیسو اسی الاؤ سے گرم آلو نکال کر کھاتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ٹھنڈے الاؤ میں آلو کس طرح بھونے گئے؟ اسی طرح مصنف مرکزی کرداروں کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگ مادھو اور گھیسو کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر ان کو قرض دے دیا کرتے تھے حالانکہ انھیں وصولی کی مطلق امید نہ ہوتی تھی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے مکینوں میں ہمدردی کے جذبات بدرجہ غایت پائے جاتے تھے۔ مگر پھر اتنے رحم دل لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن تھا کہ دردِزہ کی وجہ سے بدھیا کی حالت غیر ہو، اور اس کے علاج کے لیے لوگ انھیں قرض نہ دیں؟ مصنف نے دراصل زورِ بیاں پیدا کرنے کے لیے کسی حد تک مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ باوجود یہ کہ وہ خود بھی دیہاتی تھا، یہ بھول گیا کہ گاؤں کے ماحول میں یہ ناممکن ہے کہ لوگ اس قدر بے حس ہو جائیں کہ وہ دردِزہ میں مبتلا بے کس عورت سے قطعی لاتعلقی اختیار کر لیں۔ لیکن اگر مصنف اس خامی پر قابو پانے کی

کوشش کرتا تو افسانے کا مکمل پلاٹ ہی اس کے ہاتھ سے نکل جاتا، اور افسانے سے ترقی پسند فکر خارج ہو جاتی۔ بیشتر ترقی پسند افسانوں میں مبالغہ آرائی اسی وجہ سے نظر آتی ہے کہ مصنف جبراً حالات کو اپنے نظریات کے موافق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجتاً افسانے کا بنیادی ڈھانچہ ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس جزوی جھول کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو کلی طور پر افسانہ حقائق پر ہی مبنی ہے اور واقعتاً سرمایہ دارانہ نظام انھی مسائل کو جنم دے رہا ہے جن کی نشاندہی منشی پریم چند نے کی ہے۔

(محمد عمر حبیب لمز کے طالب علم ہیں)

پریا فاطمہ سجاد

افسانہ ''کچرا بابا'' کے کچھ پہلو میری نظر میں

کرشن چندر کے افسانے ''کچرا بابا'' کے مطالعے کے بعد جو چند سوال اور باتیں میرے ذہن میں آئیں میں وہ آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گی۔

سب سے پہلے یہ کہ دُلاری کو اپنے بیمار شوہر کو، ہسپتال میں بے بسی کے ایسے عالم میں کہ جب اُس کے علاوہ اُس کا کوئی نہیں تھا، چھوڑ کر جانا چاہیے تھا؟ اس سوال نے مجھے بہت اُلجھائے رکھا۔ میں نے دُلاری اور بیمار شوہر دونوں کے تناظر (perspective) میں اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی۔

دُلاری کی عمر بیس سال تھی جب اُس کی شادی ہوئی۔ اکیس سال کی عمر میں وہ شوہر کی شدید اور طویل بیماری، سخت معاشی مسائل اور بچہ ضائع ہونے تک کی ہر تکلیف سہہ چکی تھی۔ ہسپتال کا ماحول، بیماری، موت یہ سب چیزیں دیکھنے اور سہنے کی ابھی اُس کی عُمر نہیں تھی۔ وہ جوان تھی، اُس کے اپنے خواب تھے اُمنگیں تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ زندگی میں اُس کے لیے کوئی اُمید نہیں تھی۔ خاوند کی طویل بیماری اور اُس کے نتیجے میں نوکری جانے کی وجہ سے اُسے مجبوراً ایک فرم میں نوکری کرنی پڑی۔ پھر وہاں سے وہ اپنی فرم کے مالک کے ساتھ اپنے ادھورے خوابوں کی تکمیل کے لیے چل نکلی جواب اُس کے شوہر کے ساتھ، جو ابھی ہسپتال میں زیرِ علاج تھا اور جس کی صحتیابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی، رہتے ہوئے ممکن نہیں رہے تھے۔ ایک عملی (practic al/pragmatic) انسان کی نظر سے دیکھیں، جو ضروری نہیں کہ اعلیٰ اخلاقی معیارات پر بھی اُترتا ہو، تو اُس کا فیصلہ صحیح تھا۔ اس نقطۂ نظر کے تحت زندگی صرف ایک

بار ملتی ہے اور اُسے محض فضول جذباتیت میں کھونا نہیں چاہیے۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے فیصلہ کرے۔ لیکن اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھتے ہیں۔ دُلاری نے صرف اپنی ذات اور زندگی کے بارے میں سوچا لیکن اس میں خودغرضی زیادہ تھی۔ اُسے کم از کم یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر ایسا ہی وقت خود دُلاری پر آتا تو کیا کچرا بابا اُس کو چھوڑ جاتا؟ اور اگر وہ ایسا کرتا تو اُس کے اپنے دل پر کیا گُزرتی۔

دُوسری اہم بات جس نے مجھے بہت متاثر کیا وہ یہ کہ کچرے کا ڈبہ جس کی طرف ہم کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے وہ کس طرح کچرا بابا کے لیے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے:

''شہر میں جب چینی مہنگی ہو جاتی تو مہینوں کچرے کے ٹب میں مٹھائی کے ٹکڑے کی صورت نظر نہیں آتی، جب گندم مہنگی ہو جاتی تو ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہ ملتا۔ جب سگریٹ مہنگے ہو جاتے تو سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اتنے چھوٹے ملتے کہ وہ انہیں سلگا کر پی نہیں سکتا تھا۔ جب بھنگیوں نے ہڑتال کی تھی تو دو مہینے تک اس کے ٹب کی کسی نے صفائی نہیں کی تھی۔ اور کسی روز اسے ٹب میں اتنا گوشت نہیں ملتا تھا جتنا بقرعید کے روز اور دیوالی کے دن ٹب کے مختلف کونوں سے مٹھائی کے بہت سے ٹکڑے مل جاتے تھے۔ باہر کی دنیا کا کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہ تھا جس کا سراغ وہ کچرے کے ٹب سے دریافت نہ کرسکتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم سے لے کر عورتوں کے خفیہ امراض تک!''

میں نے اپنی زندگی میں اس افسانے کے مطالعے سے پہلے کچرے کے ٹب کو اس انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ بظاہر کتنی ہی حقیر اور بے معنی کیوں نہ ہو اپنے اندر کچھ ایسی حقیقتیں چھپائے ہوتی ہے جنھیں دیکھنے کے لیے ایک خاص نظر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ نظر اُس چیز سے گہرے قلبی تعلق کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔

میری نظر میں اس افسانے کا تیسرا اہم پہلو ان دو جملوں میں چھپا ہوا ہے ''یہ دنیا بھی ایک کچرے کا ڈھیر ہے۔۔۔ اس دنیا سے نیکی ختم ہوسکتی ہے، وفا ختم ہوسکتی ہے، رفاقت ختم ہوسکتی ہے، لیکن غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔''

افسانہ نگار کے کچرے کا ٹب دنیا کا استعارہ ہے جو گندگی اور غلاظت سے بھری ہے، جہاں نیکی اور وفا آٹے

میں نمک کے برابر ہے۔

لیکن اس کچرے کے ٹب میں اُمید کی ایک کرن ہے اور وہ ہے ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ جو اس بات کی علامت ہے کہ خدا ابھی تک انسانوں سے مایوس نہیں ہوا۔ کچرا بابا اس دنیا کا اصل چہرہ دیکھ کر اس سے لاتعلق ہو چکا تھا اور ایک مدت سے کچرے کا ڈھیر ہی اس کی کل کائنات تھی۔ اس کو باہر کی دنیا سے نفرت تھی، وہ اُسے ٹھکرا چکا تھا۔ لیکن ایک رات جب اُسے اُسی کچرے کے ڈھیر سے ایک نومولود (new born baby) روتا بلکتا ہوا ملا تو اگلے ہی دن وہ اس کچرے کے ٹب کو چھوڑ کر اُس کے پاس ہی بننے والی عمارت میں مزدوری کر رہا تھا، اس معصوم زندگی کو پروان چڑھانے کے لیے۔

(پریا فاطمہ سجاد لمز کی طالب علم ہیں)

عثمان ابراہیم

منٹو کا ''یزید'' میری نظر میں

آنے والی سطور میں آپ کے سامنے سعادت حسن منٹو کے افسانے ''یزید'' کا جائزہ پیش کروں گا۔ یہ تجزیہ میری اپنی سوچ اور فکر پر مبنی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ آپ اس سے اتفاق کریں۔ افسانہ ''یزید'' منٹو کے کم پڑھے جانے والے افسانوں میں سے ہے لیکن موضوع کی گہرائی، کاٹ اور جدت کے اعتبار سے اُن کے مشہور افسانوں سے کسی طرح کم نہیں۔

یہ افسانہ تقسیمِ ہند کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ کہانی کے واقعات تقسیمِ ہند کے فوراً بعد پاکستان کے ایک سرحدی علاقے، جو غالباً پنجاب کا ایک گاؤں ہے، میں پیش آتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار کریم داد ہے جو سفید ان پڑھ لیکن دلیر، سمجھدار اور عملی سوچ رکھنے والا زندگی سے بھرپور انسان ہے۔ کریم داد کا گاؤں تقسیم کے مصائب سے براہِ راست متاثر ہوا۔ خود کریم داد کا باپ بھی بلوؤں میں کام آ گیا تھا جسے کریم داد نے اکیلے گاؤں کے ایک پرانے کنوئیں کے قریب دفن کیا تھا۔ تقسیم اور اس کے ہنگاموں کے بعد کچھ وقت گزرتا ہے اور کریم داد اُسی گاؤں کی ایک مٹیار جیناں سے شادی کر لیتا ہے جو اُسے پہلے سے ہی پسند تھی۔ جینا کا بھائی بھی جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا، ان فسادات میں مارا گیا تھا جس کا جینا کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا۔ آہستہ آہستہ کریم داد کے ساتھ کی بدولت اُس کا خوف اور مایوسی کم ہوتی گئی۔ وہ خوش مزاج ہونے لگی اور اُس کی نمناک آنکھوں میں مسکراہٹ پھر سے کھیلنے لگی۔ اسی دوران ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے۔ اس تازہ خوشی کو ابھی کچھ ہی عرصہ گزرتا ہے کہ خبریں آنے لگتی ہیں کہ پاکستان

اور ہندوستان کی جنگ ہوگی اور یہ کہ ہندوستان والے پاکستان کے دریا بند کر رہے ہیں۔اس خبر سے گاؤں پر ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔اس کا مطلب پانی کی قلت سے زمینوں کی تباہی تھی جو اُن کی روزی روٹی کا ذریعہ تھی۔ اس صورتحال میں جب گاؤں والے ہندوستان والوں کو نفرت اور غصے میں گالیاں دے رہے ہوتے ہیں تو کریم داد اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتا ہے اور چوپال میں موجود باقی سب جذباتی لوگوں کو بھی اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنے کا کہتا ہے۔اُس کا کہنا ہے کہ دشمن ہمارے دریا بند کر رہا ہے اور ادھر ہم صرف اُسے گالیاں دے کر سمجھتے ہیں کہ حساب برابر ہوگیا۔دریا ایک آدھ دن میں تو بند نہیں ہو سکتے ہمیں اس کا حل سوچنا چاہیے۔ایک دن کریم داد چوپال میں اسی طرح کی بحث کے بعد گھر پہنچتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے تو وہ خوشی سے چلا اُٹھتا ہے،اور اسی خوشی کے عالم میں وہ اپنے بیٹے کو یزید کا نام دیتا ہے،جس پر دایہ اور اس کی بیوی کا منہ حیرت اور پریشانی سے کُھلا کا کُھلا رہ جاتا ہے۔اس پر کریم داد ان دونوں کو تسلی دیتا ہے کہ''ضروری نہیں کہ یہ بھی وہی یزید ہو۔۔۔اُس نے دریا کا پانی بند کیا تھا۔۔۔یہ کھولے گا۔''

کریم داد نے اپنے بیٹے کا نام آخر یزید کیوں رکھا؟ کیوں؟ کیا ہمارے معاشرے میں کوئی ذرا سی بھی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا آدمی اپنے بیٹے کا نام یزید رکھنا چاہے گا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یزید ہماری تاریخ کا بہت بُرا،ظالم اور مطعون کردار ہے۔ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے بھی اُس نے اپنے بیٹے کا نام یزید رکھا۔دراصل کریم داد یہ سمجھتا ہے کہ یزید محض ایک نام ہے اور نام محض الفاظ کا ایک مجموعہ۔اور یہ خود مختار نہیں ہوتے اگر انھیں اکیلا اور آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ منہ کُھلنے و بند ہونے اور زبان کی حرکت سے آواز پیدا ہونے والی آواز کے سوا کچھ نہیں ۔ پیار،انصاف، آزادی سب الفاظ ہیں،ایسے الفاظ جن کے لیے لوگ اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں لیکن اگر اُن کو اُن کے معنی سے آزاد کر دیا جائے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ یہ بات منٹو اسی افسانے میں ایک اور جگہ بھی بیان کرتے ہیں۔کریم داد کو بڑی کوفت ہوتی ہے جب گاؤں والے چوپال میں بیٹھے ہندوستان والوں کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں۔لیکن جب وہ اپنے بیٹے کو سوّر کہہ کر بُلاتا ہے تو اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ایسا کیوں؟ یہ اسی وجہ سے ہے کہ پیار کی گالی اور نفرت کی گالی میں وہی فرق ہے جو پرانے یزید اور کریم داد کے یزید میں ہے۔

کریم داد نہ پڑھا لکھا ہے اور نہ ہی چالاک۔ ایک سطح پر تو اُس کا کردار انتہائی سادہ اور نا قابلِ فہم نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ ایسی بصیرت رکھتا اور اس کا مظاہرہ کرتا ہے جو نہ صرف اُس کے گاؤں والے بلکہ ہم میں سے بھی کم ہی لوگ رکھتے ہوں گے۔ کریم داد کو یہ حکمت اور بصیرت ہمارے نامور ادیب منٹو نے دی ہے۔ اپنے کردار کریم داد کی طرح منٹو بھی جمع تفریق میں نہیں پڑتے تھے۔ وہ بس حقیقت (اور حقیقت بھی وہ جو اُن کی نظر میں حقیقت ہوتی) بیان کرنا پسند کرتے اور سوچنا سمجھنا وہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیتے تھے۔ اُوپر میں نے جو کچھ بیان کیا وہ اس افسانے کا صرف ایک پہلو ہے۔ ایک افسانے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں اور منٹو نے کئی افسانے تحریر کیے۔ ان سب افسانوں کے سارے پہلو تلاش کرنے میں انسان کی ساری زندگی نکل جائے۔ مگر ایک بات اس حوالے سے اہم ہے اور وہ یہ کہ لکھتے وقت منٹو کے ذہن میں صرف ایک چیز ہوتی تھی: حقیقت۔ میں اُن کے اپنے الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

''ہم لکھنے والے پیغمبر نہیں، ہم ایک ہی چیز کو، ایک ہی مسئلے کو مختلف حالات میں مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور دنیا کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ اسے قبول ہی کر لے۔''

(عثمان ابراہیم لمز کے طالب علم ہیں)

وکش اویس

ن م راشد: ایک مختصر مطالعہ

بیسویں صدی کے انسان نے جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی ہے، اس کا منہ بولتا ثبوت جدید حالات ہیں جہاں بجلی، ٹی وی اور کمپیوٹر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی بدولت ادب میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں اور نئے نئے مضامین داخل ہوئے۔ اردو ادب میں لگے بندھے مضامین کو رد کر دیا گیا اور ہر شاعر کی اپنی دنیا بننے لگی جہاں وہ اپنی سچائی بیان کرنے لگا۔

مضامین کے اعتبار سے بات کی جائے، تو ن م راشد کی کائنات بے حد وسیع ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے باقی ہم عصر شعراء سے مختلف ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض کے ہاں سیاسی معاملات بہت اہم ہیں جبکہ مجید امجد کی شاعری میں حیات و کائنات کے بڑے مسائل ہیں، جہاں وہ وقت کی جبریت کا فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن ن م راشد کے ہاں وہ فکری و تخیلاتی ہم آہنگی ملتی ہے کہ وہ انسان کے ہر مسئلے پر غور و فکر کرتے ہیں اور اس کائنات میں موجود آسمان سے زمین تک بڑے بڑے موضوعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ ہماری روح کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میرا جی کی طرح راشد علامتی شاعری کے ماہر نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ''اندھا کباڑی'' قابل ذکر ہے۔ جہاں اندھا کباڑی ان خوابوں کو جمع کر رہا ہے جو لوگوں نے پھینک دیئے ہیں۔ خواب دراصل معاشرے کی اصلاح کا پہلا پڑاؤ ہیں کیونکہ جب تک کوئی خواب نہیں دیکھے گا تب تک ترقی کیسے ہوگی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اندھا کباڑی پہلے خواب مفت دیتا ہے مگر بعد میں کہتا ہے:

لے لو مجھ سے ان کے دام بھی

خواب لے لو خواب

میرے خواب

خواب میرے خواب

راشد کا تخلیقی سفر جس قدر طویل اور گُوناگوں تھا اس کا اندازہ ان کی چار کتابوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے: ماورا، ایران میں اجنبی، لا= انسان اور گماں کا ممکن۔ اگر ان کتابوں کے ناموں پر بھی غور کیا جائے تو ان میں موجود تفکر اور گہرائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات لاتعداد ہیں۔ وہ اس بات کے داعی تھے کہ ہر شاعر کو آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ راشد کے ہاں داخلی موضوعات زیادہ نمایاں ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خارجی پہلوؤں سے راشد بالکل کنارہ کر لیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''اسرافیل کی موت'' ہے، جہاں وہ ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ وہ اسرافیل کو تخلیقی استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور ظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، لیکن ترقی پسندوں کی اصلاحی و مقصدی شاعری کے برعکس راشد کی یہ نظم نعرہ نہیں ہے۔ وہ سیاست، مقصدیت اور پروپیگنڈے سے شاعری کے جمالیاتی حُسن کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔

اسی طرح نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو'' میں بھی راشد پراُمید دکھائی دیتے ہیں اور ایک ایسے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں جو ڈرتا نہیں ہے بلکہ ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔

اژدہامِ انسان سے فرد کی نوا آئی

ذات کی صدا آئی

راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے

اک نیا جنوں لپکے

آدمی چھلک اٹھے

آدمی ہنسے دیکھو

شہر پھر بسے دیکھو

تم ابھی سے ڈرتے ہو

ن م راشد کی شاعری کسی سیاسی یا ادبی تحریک کی محتاج نہیں بلکہ ان کی شاعری کے بیشتر موضوعات ان کے داخلی رُجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا خواب صرف وہ آزادی نہیں جو ظالم طبقے سے حاصل کرنی ہے بلکہ وہ آزادی ہے جو انسان نے اپنی روایت، گھسی پٹی سوچ اور اپنے اندر موجود جکڑ بندیوں سے لینی ہے۔ انسانی تخلیق اور ترقی ان کے لیے بے حد اہم ہے بلکہ وہ تو ایسے انسانوں سے جینے کا حق بھی چھین لیتے ہیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ جو لوگ خواب نہیں دیکھتے ان کے لیے مرجانا ہی بہتر ہے۔

اجل، ان سے مت کر حجاب

اجل، ان سے مل!

تم بھی آگے بڑھو

ایک طرف جہاں راشد نے اردو ادب میں داخلی موضوعات کو جگہ دی وہیں انھوں نے ہیئت کے تجربے بھی کیے۔ اس سے پہلے اردو نظم سیدھی لکیر پر چلتی تھی جہاں پہلے نظم میں تعارف ہوتا تھا، اس کے بعد بیان اور آخر میں منطقی انجام۔ لیکن ن م راشد نے نہ صرف اردو نظم کو ردیف اور قافیے کی پابندی سے آزاد کیا بلکہ داخلی آہنگ کو بھی وہ اہمیت فراہم کی جو پہلے نہیں دی جاتی تھی۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ آزاد نظم کی صورت میں ہے اور ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے آزاد نظم کو اپنی باطنی ضرورت کے تحت استعمال کیا۔ ن م راشد نے آزاد نظم کو اس طرح سے بیان کیا ہے لگتا ہے کہ ان کی شاعری اور موضوعات خود آزاد نظم کی ہیئت کو چن کر لائے ہیں۔

درحقیقت آزاد نظم اظہار کا وہ پیرایہ ہے جہاں ظاہری آہنگ سے زیادہ خیال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ردیف اور قافیے کی عدم موجودگی سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ نظم میں وزن نہیں ہے بلکہ بحر کی باقاعدہ طور پر پابندی ہوتی ہے۔ ن م راشد نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے وہ پیرایہ منتخب کیا جہاں انھیں لفظ کی خاطر ٹھہرنا نہ پڑے۔ اپنے ایک

انٹرویو میں وہ خود کہتے ہیں:

''میں غزل کا دشمن نہیں ہوں جیسے بعض لوگ سمجھتے ہیں لیکن مجھے یہ نظر آیا کہ میرے لیے ایک وسعت موجود ہے اور ایک نیا رستہ موجود ہے خیالات کے اظہار کے لیے۔ یہ جو خیالات آ رہے تھے، جو مشاہدات تھے، جو محسوسات تھے ان کو بیان کرنے کا ایک نیا ذریعہ ہمارے ہاتھ لگ گیا۔''

اگر ن م راشد کی زبان و بیان پر غور کیا جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ زبان کے حوالے سے ان کے ہاں غالب اور اقبال کی چھاپ ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں فارسیت کے اثرات غالب ہیں اور شاید اس کی بڑی وجہ ان کی تربیت ہے۔ ویسے تو فارسیت فیض احمد فیض کے ہاں بھی ہے مگر وہاں زبان میں بے تکلفی ہے۔ لیکن ن م راشد کے ہاں زبان کا محاورہ ویسا نہیں ہے بلکہ الفاظ بلند آہنگ ہیں۔

ایک طرف جہاں ن م راشد نے فارسی الفاظ و تراکیب کو اتنی اہمیت دی ہے وہیں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات نے ان کی نظموں کو حسن دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ راشد کے ہاں جو استعارے استعمال ہوئے ہیں وہ غیر روایتی ہیں اور اس لیے قاری کے لیے فہم کے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ جب وہ کوئی تشبیہ بھی استعمال کرتے ہیں تو اس قدر گہری معنویت چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا جدوجہد کیے بغیر سمجھ نہیں سکتا۔ ''بے کراں رات کے سناٹے میں'' کے مصرعے دیکھیے۔

آرزوئیں ترے سینے کے کوہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

ان کے استعارات پر بھی غور کیا جائے تو راشد کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ راشد نے تخلیقی استعاروں کا بھرپور استعمال کیا ہے یعنی ایسے استعارے جو نظم کے اندر سے ہی پیدا کیے گئے ہوں۔ کیونکہ راشد کی شاعری اپنی ہم عصر فارسی شاعری سے متاثر ہے اسی لیے ان کے ہاں تلمیحات کی جڑیں بھی فارسی سے جڑی ہوتی ہیں۔ نہ صرف ان کا اسلوب تخلیقی ہے بلکہ تخلیقی استعاروں میں راشد کو جو دسترس حاصل ہے یہ انھی کا خاصہ ہے۔ وہ ہر استعارہ خیال کی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''اسرافیل کی موت'' میں اسرافیل کو تخلیقی استعارے کے طور پر استعمال

کیا گیا ہے یا پھران کی نظم ''زندگی اک پیرہ زن'' میں 'پیرہ زن' یعنی بوڑھی عورت ایک تخلیقی استعارہ ہے جو زندگی کو ظاہر کررہی ہے۔

اسی پس منظر میں راشد کی نظم ''خودکشی'' بھی بہت اہمیت رکھتی ہے جہاں تلمیح کو نیا معنی دیا ہے۔

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

یہاں پر وہ یاجوج ماجوج کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔مگران کے ذریعے اس بات کو ظاہر کیا گیا ہے کہ ارادہ بنتا ہے اور پھر ٹوٹ جاتا ہے۔لہٰذا انھوں نے تاریخی واقعے کو جس طرح ایک نئے تخلیقی استعارے کی شکل دی ہے وہ قابلِ توصیف ہے۔

اردو ادب میں ن م راشد کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی نظم ''حسن کوزہ گر'' ہے جس کو اردو شاعری کا شاہکار کہا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے مطابق حسن کوزہ گر شاید بیسویں صدی کی سب سے بڑی نظم ہے۔افتخار عارف اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں:

''گذشتہ چالیس پچاس برسوں میں جو بھی تھوڑا بہت ادب دیکھا ہے تخلیقی عمل کے حوالے سے ایسی قوت کے ساتھ لکھی گئی نظم اور ایسا آہنگ اور ایسی فضا جیسی حسن کوزہ گر میں ہے، مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔''

یہ نظم ایک تخلیقی فنکار کا المیہ ہے جو اپنے کوزوں کے ساتھ ساتھ کوزہ گری کے فن سے بھی محروم ہو گیا ہے اور اپنی محبوب جہاں زاد کی ایک نگاہ کا طلب گار ہے تا کہ تخلیق کی صلاحیت دوبارہ پالے۔اس نظم میں عشق اور تخلیق دو بڑے موضوعات ہیں اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہاں پر کوزہ گر ایک تخلیق کار ہے۔تخلیق یا creativity کے لیے کوزہ گری کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔شاید یہ کوزہ گری کا انتخاب اس لیے ہے کہ انسان بھی مٹی سے بنا ہے اور کوزہ بھی اور دونوں کو آخر کار فنا ہو جانا ہے۔لیکن اگر ہم اس نظم کا سب سے بڑا موضوع تلاش کریں تو وہ شاید فن اور عشق کا

تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ راشد یہاں اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ تخلیق کے لیے عشق ضروری ہے۔ یعنی وہ انسان جو محبت کے جذبے سے سرشار ہو وہ تخلیقی قوت کا بہتر استعمال کرے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب

ایک طرف جہاں یہ نظم موضوع کے لحاظ سے اتنی مربوط ہے وہیں اس کا لب و لہجہ اور فضا بھی دلکش ہے۔ یہ نظم درحقیقت کہانی کی طرز پر ہے بلکہ یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ اس نظم کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ اس نظم کے کردار ایک الف لیلوی فضا میں سیر کر رہے ہیں اور شاید اسی لیے یہ ایک افسانوی نظم ہے۔ منظر کشی کے جوجوہر اس نظم میں موجود ہیں ان کا اندازہ اس حصے سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات،
وہ رودِ دجلہ کا ساحل،
وہ کشتی، وہ ملاح کی بند آنکھیں،
کسی خستہ جاں، رنج بر، کوزہ گر کے لیے،
ایک ہی رات وہ کہربا تھی

شاعر نے اس حصے میں جگہ کا تعین کر دیا ہے مگر اس کے باوجود قوتِ باصرہ کو اس قدر فن کاری سے متحرک کیا گیا ہے کہ پورا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

ن م راشد کی شاعری میں ابہام کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ قاری کاوش اور محنت کے بغیر انھیں سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد دنیا کچھ بدل سی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راشد نہ صرف تخیلاتی بلکہ فکری اعتبار سے بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ اردو میں جدید طرزِ احساس کو راشد سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ راشد ان اولین شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اسے متعارف کروایا۔ آزاد نظم کو بھی اردو ادب میں پہچان اور مقام دلوانے میں

راشد کا بہت بڑا کردار ہے۔ اگرچہ اُن کی اپنی زندگی میں اُن کی شاعری کی وہ تفہیم اور تشریح نہ ہو سکی جو اب ممکن ہے۔ یہ بھی دراصل ایک آفاقی شاعر کی صفات میں سے ایک بنیادی صفت ہے۔ ان کی شاعری اوّل تا آخر ارتقا کا ایک غیر منقطع سفر ہے۔ ن م راشد جدید زمانے کا وہ شاعر ہے جو ہر فرد کو اپنی ذات کا احساس دلاتا ہے اور اپنے اندر جھانکنے کا درس دیتا ہے۔

(وکش اویس لمز کے طالب علم ہیں)

عبدالوہاب نیاز

غالبؔ کا صوفیانہ انداز

غالب کے ہاں شاعری ایک فن تو ہے ہی، لیکن اس میں موجود متنوع سوچ اور فکر اسے ادب کی دنیا میں ایک الگ مقام بخشتی ہے۔ غالب کا جداگانہ اسلوب سخن کی کہکشاؤں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب ایک ایسے شاعر ہیں جنھیں ہر دور میں پڑھا جاتا رہا ہے اور پڑھا جائے گا۔ غزل میں اندازِ بیاں ایسا ہے کہ شعر پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شعر غالب کا ہی ہو سکتا ہے۔

غالب نے اردو شاعری میں مختلف جہتوں کو موضوع بنایا جو کہ مزید کئی رنگوں کا باعث بنیں۔ روایتی انداز سے مختلف شاعری کی اور منفرد مضامین اور موضوعات کو قلم بند کر کے شہرتِ دوام حاصل کی۔ اُردو غزل گوئی میں جتنی شہرت غالب نے پائی ہے، شاید ہی کسی اور کو حاصل ہوئی ہو۔ لیکن اِس معاملے میں غالب کی عجز و انکساری کا اندازہ اِس شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ریختہ کے تمھی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب کی انا بھی اُن کی ایک پہچان ہے۔ لیکن اُن کی شاعری اور خطوط میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔ اس تضاد

سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی زندگی میں غالب ایک عاجزانہ شخصیت کے مالک تھے جو کہ اپنی عزتِ نفس کی پاسداری پر یقین رکھتے تھے۔

نوجوانوں نے غالب کو رومانوی شاعر سمجھا جب کہ بڑوں نے اسے ایک فلسفی۔ اور میرے خیال میں یہی امتزاج غالب کی متنوع سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ ہر سوچ اور جذبے کو اِس طرح سے موزوں کرتے کہ ہر رنگ ایک الگ دھنک تشکیل دیتا۔ مختصر یہ کہ غالب کے ہر رنگ کو پسند کیا جاتا ہے۔

دیوانِ غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے مرزا غالب کا ایک اور رنگ سامنے آتا ہے جو کہ صوفیانہ ہے۔ خود احتسابی، مایوسی سے دوری، ایمان و کفر کے مابین کشمکش، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دیدارِ الٰہی، انکساری اور تصوف جیسے موضوعات ان کے صوفیانہ رنگ کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک جگہ پر غالب کہتے نظر آتے ہیں:

دیکھیے غالب سے نہ الجھے کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب ولی یا صوفی ہے یا کوئی ایسا پارسا شخص ہے جو گناہ نہیں کرتا۔ بلکہ یہ ظاہر اور باطن کی متضاد کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی اصل طاقت یعنی صوفیانہ کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ غالب جگہ جگہ خود احتسابی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غالب کے ایک شعر میں خود احتسابی کی مثال دیکھیے:

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اپنے اندر موجود اچھائی و برائی، نیکی و بدی کی کشمکش کا اظہار غالب نے اِس انداز میں کیا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب خود کو ایک سچا شاعر کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اگر چہ وہ خود کو پارسا نہیں کہتا:

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

جب غالب مایوس ہوتا ہے تو اپنی ناامیدی نہیں چھپاتا:

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

گویا غالب اپنے احساسات کو کھل کر بیان کرتا ہے اور کبھی حقائق کو جھوٹ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اپنی اِسی خوبی کو وہ خود بیان کرتا ہے:

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اسی طرح غالب ہمیں نصیحتیں کرتا بھی نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیشہ اچھا سوچو اور اچھا کرو۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔ گویا کہ جو بوؤ گے، وہی کاٹو گے۔

یہ دو اشعار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں بھی سن لیجیے:

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار میں غالب کا صوفیانہ رنگ بہت نمایاں ہے۔ صوفیاے کرام اکثر فرماتے ہیں کہ دنیا میں وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، ان کی جزا صرف بہشت نہیں بلکہ دیدارِ الٰہی اور قربتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اصل انعام یہی ہے جب کہ بہشت ان انعامات کے ملنے کا مقام ہے۔

غالب نے اپنے اشعار میں ان خیالات کی ترجمانی کچھ اس انداز میں کی ہے:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

دیدارِ الٰہی کی خواہش کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

غالب کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ہر دل کا حال جانتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ بندہ کیا چاہتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ پر یقین بھی رکھتا ہے کہ میں جو مانگ رہا ہوں وہ ضرور ملے گا۔ اسی لیے غالب پکار اٹھا:

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

گویا غالب یقین رکھتا ہے کہ اللہ سے ایک مرتبہ جو مانگا ہے، وہ ضرور ملے گا۔ لہٰذا بار بار عرض کی ضرورت نہیں۔ یہ بات وہ اس انداز میں کہتا ہے:

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب! گنبد بے در کھلا

غالب کہیں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں۔ اس کو خدا تعالیٰ پر پختہ یقین ہے کہ جو غلطیاں کوتاہیاں ہم سے سرزد ہو جاتی ہیں، اگر ہمیں ان کا احساس ہو جائے تو معافی مل جائے گی:

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

صوفیانہ رنگ لیے مزید دو اشعار:

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پھر غالب کو اپنے گناہ، کوتاہیاں اور غلطیاں یاد آ جاتی ہیں اور اپنی حسرت کو شعر میں کچھ یوں بیان کرتا ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اللہ کی راہ میں جان دینا بہت بڑی نیکی ہے۔ شہید کے بہت سے درجات ہیں، اس کی بخشش بغیر حساب کے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے مسلمان کی زندگی خرید لی ہے۔ غالب اس کرم کو اللہ کا سب سے بڑا احسان مانتا ہے۔ اس لیے ہماری زندگی اس اللہ کی ملکیت ہے۔ تمام جہانوں کا وہی مالک ہے، وہی خالق ہے۔ اس کی بادشاہی ہر جا ہے۔ غالب اس نظریے کو اپنے شعر میں کچھ یوں بیان کرتا ہے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انھی خیالات کے بارے میں غالب کا ہی کہنا ہے کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

ان چند اشعار کا انتخاب غالب کے صوفیانہ رنگ کو اجاگر کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اور بھی کئی اشعار ہیں جو غالب کے اس رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

غالباً غالب اپنے صوفی رنگ کو چھپانا چاہتا ہے۔ یقیناً اسی لیے وہ ایک شعر میں بول اٹھتا ہے کہ:

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

(عبدالوہاب نیاز لمز کے طالب علم ہیں)

وقار سپرا

’’کئی چاند تھے سر آسماں‘‘ کی تاریخی پس منظر میں اہمیت

’کئی چاند تھے سر آسماں‘ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں لکھے جانے والا ایک ایسا ناول ہے جس کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس ناول کا اُفق (canvas) بہت وسیع ہے۔ جس میں مصنف نے ہند اسلامی تہذیب کی بازیافت کی ایک کوشش کی ہے۔ اس ناول پر بات شروع کرنے سے پہلے مصنف شمس الرحمن فاروقی کا کچھ تعارف بھی ضروری ہے۔

شمس الرحمن فاروقی تقسیمِ ہند سے قبل ۱۹۳۵ میں ہندوستان (موجودہ بھارت) کے شہر اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر انڈین سول سروس کا امتحان دیا۔ امتحان میں کامیاب ہو کر محکمہ ڈاک میں افسر تعینات ہوئے اور پھر اسی محکمہ کے سربراہ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور دہلی کی جامعہ ملیہ سے بھی وابستہ رہے۔ ان کو حکومت ہند کی طرف سے ادبی خدمات کے اعتراف میں بھارت کے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ میں سے ایک ’’پدم سری‘‘ (Padam Shri) 2009 سے نوازا گیا۔ ادبی دنیا میں ان کا سفر ایک شاعر کی حیثیت سے شروع ہوا جو تنقید اور افسانے سے ہوتا ہوتا ناول نگاری جیسی سطح پر آ پہنچا۔

’کئی چاند تھے سر آسماں‘ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں لکھا گیا۔ یہ نہ صرف اپنے دور کا بلکہ اب تک کی تنقیدی آرا کے مطابق اردو کے صفِ اول کے ناولوں میں سے ایک بن چکا ہے۔

دنیا کے بڑے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی وسیع تر تناظر (perspective) میں لکھا گیا ناول ہے۔ یہ یقینی طور پر انیسویں صدی (19th) کے ابتدائی عشروں کی ایک منفرد اور مختلف حوالوں سے مشہور اور غالبًا اپنے دور کی حسین ترین خاتون ''وزیر بیگم'' کی داستان حیات لگتی ہے۔ اس میں اس کے محسوسات کو غیر معمولی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن طالبِ علم کے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اس ناول کی تاریخی حوالہ سے بھی ایک اہمیت ہے۔ خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخری دور اور باقاعدہ راج آنے سے پہلے والے دور کے حالات و واقعات کو سمجھنے میں اس ناول کے ذریعے کافی مدد ملتی ہے۔ ماضی میں کچھ اور مصنفوں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی۔ اکیسویں صدی میں جو اردو ادب تخلیق ہوا ہے اس میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا یہ ناول اس موضوع پر اتنی تفصیلات کے ساتھ غالبًا پہلا ناول ہی ہے جس میں قاری کو نہ صرف کمپنی کے معاملات پر بلکہ 1800-1860ء کی، جو کہ برصغیر کی مسلم تاریخ میں بلاشبہ زوال کا دور تھا، ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مغل بادشاہت اپنے آخری دم پر تھی۔ اس دور کی ایک تاریخی اہمیت بہر حال ہے اور اس ناول کے ذریعے اسے دیکھنے اور سمجھنے کا ایک نیا زاویہ ملتا ہے۔ اس لیے یہ ناول ایک قسم کی تاریخی دستاویز بھی ہے اور صرف ادب کے طلبہ ہی نہیں بلکہ تاریخ اور سوشل سائنسز کے طلبہ کے لیے بھی اس ناول میں سیکھنے کے لیے کافی کچھ موجود ہے۔

اس ناول میں کافی دلچسپ تاریخی حوالے اور واقعات بیان کیے گئے ہیں جو کہ شائد پہلے عام لوگوں کے علم میں نہ تھے مثلاً عام پاکستانی لوگوں کے لیے یہ بالکل نئی چیز ہے کہ انگریز افسروں کی دیسی نوجوانوں کے نجی معاملات تک میں شمولیت اتنی زیادہ تھی اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے ان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کئی جگہوں پر سرِ شام برپا کی جانے والی انگریزوں کی نجی محفلوں میں بھی مسلم نوابوں کی شرکت ہوتی تھی اور انگریز مرد اور خواتین تک اردو/ہندی کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ سمجھتی تھیں، جیسا کہ ''پارکس'' کا حوالہ دیا گیا جہاں انگریز خواتین مرزا غالب کے ایک اردو کے شعر پر غور کر کے اس کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ چند سو یا ہزار دو ہزار انگریز برصغیر پاک و ہند پر کیسے اتنی دیر اور اتنی مضبوط حکومت کر گئے۔ میں سمجھتا ہوں امور جہان بانی میں جس صفت کو شرف حاصل ہے وہ ہے انتظام و منصوبہ بندی کی صلاحیت۔ اس ناول میں بیان کیے گئے

واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز ہر معاملے میں کتنی تفصیلی منصوبہ بندی کے قائل تھے۔ مثلاً نواب شمس الدین احمد کی گرفتاری اور بعد از گرفتاری عدالتی کارروائی اور پھر پھانسی کے حکم پر عمل درآمد کروانا۔ ہر جگہ پر انگریز افسروں نے حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی اور کسی حد تک سازش سے کام لے کر چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی مسائل سے بچنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔

انگریز حکومت اور افسروں کی اندرونی سوچ کا عکس اس ناول میں بیان کیے گئے بہت سے واقعات میں نظر آتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۵۰۶ ''انگریزی کمشنر فریزر'' کے قتل کے بعد ''سائمن فریزر'' کے سینے میں آتش انتقام تو تھی ہی، یہ موقع اس کو بہت خوب مل گیا تھا کہ اپنے ساتھی کے خون ناحق کا بدلہ بھی لے اور بشمول نواب تمام دیگر نوابین اور راجوں مہاراجوں کو یہ سخت پیغام بھی پہنچا دیا جائے کہ فرنگی حکام کی جان لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ ملک ہندوستان میں ''انگریزی راج'' صرف جبر و استبداد اور خوف کے بل بوتے پر ہے۔ اگر طاقت میں کوئی تخفیف ہوئی یا اس میں کچھ نقص آیا تو یہ لوگ ہمیں چشم زدن میں اسی طرح نوچ کھائیں گے جیسے ہمالیہ کے بھالو شہد کی مکھیوں کا چھتہ نوچ کر سارا شہد پی لیتے ہیں اور موم کو پارہ پارہ کر کے نیچے پھینک دیتے ہیں۔

اسی سوچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کس حد تک اندرونی طور پر خائف تھے، جیسا کہ لکھا ہے کہ ''اگر ہندوؤں کو ذرا موقع مل جائے تو یہ ہماری مٹھی بھر فوجی چھاؤنیاں ہماری کچہریاں اور گودام دو یا تین گھنٹوں میں لٹ پٹ کر ننگے ہو جائیں گے''۔ اور انگریزوں کی تعداد واقعی نہایت معمولی تھی۔ آبادی کے حساب سے اس کا بھی حوالہ تاریخ کے طالب علم کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔

''ملک ہند اور ملک دکن میں بھی اس وقت اکثر علاقے تو ایسے تھے کہ سینکڑوں مربع میل کے علاقے میں بس ایک انگریز گھر تھا اور اس سارے خطہ زمین پر اس کے گھر والے کی حکومت، حکمت عملی اور داؤ پیچ، اختیار اور رعب سلطنت کی بنیاد پر آسمان سے بات کرتی تھی''۔

یہ سوچ اعلیٰ و ادنیٰ ہر سطح کے انگریزوں میں تھی اور اس کی وجہ صرف وہم و احتیاط ہی نہ تھی بلکہ اس کی وجہ ماضی کے واقعات تھے جیسا کہ ناول کے صفحہ نمبر 507 میں فریزر سے جب رائے مانگی گئی تو اس نے کہا ''مجھے جو اطلاعات ملی

ہیں ان کی رو سے مقامی رعایا کی ہمدردیاں شمس الدین احمد اور کریم خان کے ساتھ ہیں۔ لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ دو ہندی جیالوں نے فرنگی صاحب کا منہ جھلس دیا ہے''۔'' ''Have taken the torch to the firanghees face

ایسی صورت میں ہمارے لیے اور بھی ضروری ہے کہ ہم سخت ترین تعزیری اقدامات کریں اور کھلے بندوں کریں۔''تو آپ کے خیال میں رعایا کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہ ہوگی؟ بریلی کا معاملہ' بریلی والا معاملہ اور تھا، اسے بھول جایئے دلی کے عیش پسند مرزا لوگ اور جوابی کارروائی؟ یعنی انگریز افسروں نے تعلق واسطہ بنا کر قریب ہو کر ہندوستانی اشرافیہ (elite) کی نفسیات کو سمجھنا شروع کر رکھا تھا۔ بریلی کے واقعہ میں کمپنی کی سرکار کا بہت نقصان ہوا تھا۔لیکن اب فریزر نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ بریلی اور دہلی والوں کی نفسیات میں فرق ہے۔ یہ آرام پسند امیر لوگ ہیں انھوں نے کیا لڑنا ہے اور یہ بات بھی سمجھ لی کہ نواب کی سرعام بھرے شہر میں جب پھانسی ہوئی تو اہل دہلی صرف تماشا دیکھنے آئے تھے اس کے بعد اپنی آرام دہ زندگیوں میں لوٹ گئے۔ ہاں البتہ ایک کام ضرور کیا اہل دہلی نے وہ یہ کہ پھانسی کے بعد کئی ہفتوں تک گلی کوچہ کی گپ کا موضوع نواب کی شخصیت اور جرات اور بہادری ہی رہا۔ یہ تھا اہل دہلی کا ردعمل نواب شمس الدین احمد کی پھانسی کے واقعہ کے بعد۔

اس کے بعد اب آتے ہیں نواب شمس الدین احمد کی گرفتاری کی طرف۔ اس میں بھی جہاں انگریز افسروں کی منصوبہ بندی ظاہر ہوتی ہے وہاں اس واقعہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نواب شمس الدین احمد بھی دور اندیش اور زیرک انسان تھے۔ نواب شمس الدین احمد کو یہ بات پتہ تھی کہ کمپنی کی سرکار سے ان کو خیر کی توقع نہ تھی اور جب وہ اپنی ریاست سے نکالے گئے تو اس وقت بھی اپنے عزیز و اقارب اور خاندان کے روکنے کے باوجود وہ دلی کے لیے نکل پڑے اور نہایت وقار و خاندانی طور طریقے سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ انگریزی حکومت کے افسروں کو پل پل کی خبر تھی نواب شمس الدین احمد کے پاس پنجاب فرار ہونے کی بھی تجویز تھی لیکن انھوں نے اس کو اپنے خاندان پر آنے والے مسائل کے پیش نظر قبول نہ کیا کیونکہ نواب شمس الدین احمد جیسا خاندانی آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کے فرار کی صورت میں ان کے خاندان کے لوگوں کو انگریز حکومت پریشان کرے گی اور مزید فرار کی وجہ سے ان کا جان فریزر کے قتل میں شامل ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ اس لیے نواب شمس الدین احمد نے فیصلہ کیا کہ وہ دہلی جا کر مقدمہ کی باقاعدہ پیروی

کرے گا۔اور جو بھی نصیب میں ہوگا اس کو دیکھے گا۔ وقتِ رخصت ان کے اس جملے ''دنیا ہماری مرضی پر نہیں چلتی لیکن ہم تو اپنی مرضی سے چلتے ہیں'' سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں تمام خدشات موجود تھے۔

ایک طرف تو نواب شمس الدین احمد جیسا خاندانی شریف اور وضعدار شخص تھا تو دوسری طرف انگریز افسروں کا کردار یہ تھا کہ وہ باقاعدہ سازش کے تحت نواب کے والد کے ایک پرانے تعلق دار کو شامل کر کے سازش کے تحت دھوکے سے گرفتار کر لیتے ہیں۔ شروع شروع میں انگریز سرکار کے پیشِ نظر ہر مسئلہ میں اپنا کام نکالنا ہی اصل مقصد رہا ہے۔

تاریخی حوالے سے ایک اور بڑی اہم بات یہ بھی تھی کہ انگریز سرکار نام نہاد مغل بادشاہت کو ابھی مزید کئی عشروں تک ایسے ہی چلانا چاہتی تھی۔لیکن 1857ء میں چمڑے کی گولیوں سے اٹھنے والی تحریک جو کہ بعد ازاں ایک عظیم بغاوت میں تبدیل ہوگئی، اور بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کے ایک بیٹے نے جس کی مبینہ طور پر سربراہی کی۔ اس کی وجہ سے بغاوت کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریز سرکار نے بھی بندوبست میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں کیں۔ ورنہ 1857ء کی بغاوت سے قبل انگریز سرکار کے دفاتر میں باقاعدہ ایک فہرست موجود تھی کہ نمبر وار کس کس شہزادے نے بادشاہ بننا ہے۔

جیسا کہ صفحہ 690 میں حوالہ:

مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو کی عمر اس وقت کوئی چونتیس کی ہو گی۔ سورہ فتح کی ایک آیت مبارکہ سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۲ء نکلتی تھی۔ وہ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ کے چوتھے بیٹے تھے۔ ابوظفر محمد سراج بہادر شاہ ثانی ۲۹ ستمبر ۱۸۲۷ کو ظلِ الٰہی سربراہِ سلطنت ہوئے تھے۔ اور ولی عہدِ وقت مرزا محمد بخت بہادر عرف میراں شاہ سب سے بڑے بیٹے تھے۔ اور ٹامس مٹکاف نے انھیں پانچ اشرفیاں اس وقت نذر کر کے ان کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تھا۔ میراں شاہ بہادر کے بعد بہادر شاہ کے دوسرے بیٹے مرزا محمد شاہ رخ بہادر تھے۔ انھیں وزیر اعظم و مختار عام کا عہدہ تفویض ہوا۔ تیسرے بیٹے مرزا کیومرث بہادر کو ولی عہد دوم کا عہدہ دیا گیا۔ ان کے بعد مرزا محمد سلطان فتح الملک تھے، جنھیں ولی عہد سوم مقرر کیا گیا۔ یہ بات واضح نہیں ہوئی

ہے کہ مرزا شاہ رخ بہادر کو ولی عہد دوم کیوں نہ مقرر کیا گیا اور کیا وجہ تھی کہ وزیر اعظم و مختار عام جیسے جلیل القدر منصب کے حامل ہونے کے باوجود انھیں شاہی وراثت میں کوئی درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ مرزا محمد شاہ رخ بہادر کسی نامعلوم بنا پر بادشاہ کو بہت محبوب نہ تھے۔

مرزا کیومرث بہادر کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ وہ ذاتی لیاقت کی بنا پر یا محض ہوس کے باعث، خود کو ولی عہدی کے منصب کے لیے سب سے بہتر سمجھتے تھے۔ دولت مغلیہ میں ولی عہد نام کی کوئی چیز نہ تھی اور نہ کوئی منصب تھا۔ اور حکمران کی موت یا بزدلی کی صورت میں خانہ جنگی یا خونریزی کے بعد ہی نئے حکمران کا فیصلہ ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے یہاں بھی تعاون کر کے ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی کی ولی عہدی کے وقت یہ طے کر دیا تھا کہ حکمران کا سب سے بڑا بیٹا ولی عہد اور پھر وارثِ تاج و تخت ہوگا لہٰذا خود ٹامس مٹکاف ہی نے مرزا بخت کی ولی عہدی کا اعلان ابوظفر سراج الدین بہادر کی تخت نشینی کے وقت کر دیا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ولی عہدی اور پھر وراثت کے جھگڑے آئندہ پیدا نہ ہو سکیں گے یا یہ کہ شہزادگان اپنے طور پر ولی عہدی یا بادشاہی کے لیے ساعی نہ ہوں گے۔

اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز کبھی بھی 1857ء میں مغل بادشاہت کا خاتمہ نہ چاہتے تھے بلکہ وہ کسی نامعلوم مصلحت کے تحت مغل بادشاہ کو مزید کافی عرصہ تک برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مصنف کے پیشِ نظر صرف "وزیر بیگم" کی شخصیت ہی تھی وہ ناول کو بطور ناول نگار ہی لکھنا چاہتے تھے لیکن کئی ایسے حوالے اور واقعات ناول میں ملتے ہیں جن کی بہر حال بہت ہی اہم تاریخی حیثیت بھی ہے۔ ان میں سے چند میں نے بیان کیے ہیں۔ مختصراً ناول کے بہت سے اہم پہلو ہیں ان میں سے ایک اس کا یہ تاریخی پہلو بھی ہے۔

عمیر احمد

پاکستان کا مطلب صرف لا الہ الا اللہ؟

کیا ریاست اور مملکت کی قید سے آزاد ہو کر بھی پاکستان کے کچھ معانی ہیں یا پھر یہ ایک جغرافیائی حدود میں بسنے والے لوگوں کی محض ایک مجموعی پہچان ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اور اسرائیل دنیا کی دو واحد نظریاتی ریاستیں ہیں۔ اس دعوے سے قطع نظر اگر پاکستان کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ نظریاتی تضادات سے بھری پڑی ہے۔ کبھی سوشلزم کا نعرہ لگا اور کبھی اسلامی انقلاب کا، کبھی مغربی جمہوریت تو کبھی فوجی آمریت۔ اور ہر دو میں سے کسی ایک کے اقتدار میں آنے کے بعد دوسرے کے لیے کوشش اور اُس کے استقبال کی تیاری۔ ہمارے اس قومی سفر کی میوزیکل چیئر کا جو نتیجہ نکلا وہ بقولِ شاعر کچھ یوں ہے:

نہ خدا ہی نہ ملا نہ وصالِ صنم

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں آئین سازی کی دو ناکام کوششیں کی گئیں، لیکن پھر آزادی کے ۲۶ سال بعد ۱۹۷۳ء میں موجودہ آئین پاس ہو گیا جسے بہر حال پاکستان کا متفقہ آئین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ گزشتہ ۴۳ سال میں اس آئین میں تقریباً اکیس (۲۱) ترامیم کے ذریعے اس میں بے دریغ تبدیلیاں کی گئیں۔ کبھی فوجی حکمرانوں نے تو کبھی عوامی نمائندوں نے اسے اپنے مفادات کے سانچے میں ڈھالا۔

اپنی ۶۹ سالہ تاریخ میں پاکستان نے بہت سے اُتار چڑھاؤ دیکھے، کبھی اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی کی وجہ سے یہ دولخت ہو گیا اور کبھی ہندوستان سے مختلف اوقات میں نبرد آزما رہا اور اب پچھلے کچھ عرصے سے یہ دہشت گردی

کے خلاف فیصلہ کُن جنگ لڑ رہا ہے۔ کبھی عالمِ مغرب بشمول امریکہ سے دوستیاں اور وفاداریاں نبھائی گئیں اور کبھی روس اور چین سے رجوع کیا گیا اور پھر کبھی اتحادِ عالمِ اسلامی کی کوششوں میں حصہ لیا گیا۔ کبھی منتخب وزیراعظم کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا تو کبھی سابق آمروں پر سنگین غداری کے مقدمات چلائے گئے۔ لیکن اس سب کا نقصان صرف اور صرف پاکستان کو اُٹھانا پڑا۔ مسلسل سیاسی ہلچل کی کیفیت میں عوام سماجی اور معاشی استحکام سے محروم رہے۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی کو جب کبھی اقتدار کے ایوانوں تک رسائی ملی اُس نے پالیسیوں کا رُخ اپنے مفادات کی طرف موڑ لیا۔ اس دوران میں کبھی معاشی خودمختاری کے گُن گائے گئے اور کشکول توڑنے کی خوشخبری سنائی گئی اور کبھی وہی کشکول لے کر عالمی مالیاتی اور اقتصادی اداروں کے در پر دستِ سوال پھیلایا گیا۔ جہاں عوام نے اس عدم استحکام کا نقصان معاشی بد حالی اور امن وامان کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کی صورت میں اُٹھایا وہیں اس کا یہ نقصان بھی اُٹھایا کہ یہ دیکھتے دیکھتے اپنے اُس مقصد اور آدرش سے بھی ہٹتا گیا جس کے لیے اسے حاصل کیا گیا تھا۔

۱۹۴۷ میں تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھی تو اس وقت پاکستان محض ایک ریاست یا مملکت کا نام نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی تمام مظلوم لوگوں اور قوموں کی اُمیدوں کا مرکز تھا۔ پاکستان اس سوچ کا نام تھا جس کے تحت عددی اکثریت و برتری کی بنا پر اقلیتوں کے حقوق پامال ہونے سے بچائے جاسکتے تھے۔ بدقسمتی سے آج پاکستان خود اپنے دامن میں بسنے والی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکام ہے۔ اس کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ پاکستان کو مختلف طاقتور گروہوں (میں یہاں اُن کا نام نہ بھی لُوں تو آپ سمجھ جائیں گے) نے اپنی ذاتی جاگیر بنائے رکھا اور پاکستان کی سیاسی تاریخ انھیں گروہوں کی باہمی کشمکش کی داستان ہے۔ ان گروہوں نے مذہبی مقامات سے لے کر اعلیٰ ملکی اداروں کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ ان لوگوں نے یہ باور کرایا کہ پاکستان صرف اور صرف خاص طرح کے مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا اور ان کے علاوہ اس پر کسی اور کا کوئی حق نہیں۔ یہ سوچ دراصل پاکستان کی بنیاد کے عین منافی ہے۔

اگر پاکستان کو حقیقی معنوں میں اُس کے بانیوں کے خوابوں کی تعبیر بنانا ہے تو ضروری ہے کہ پاکستان کو اُس کے باہمی اتحاد کے دُشمنوں کے قبضے سے آزاد کرایا جائے۔ ریاستی اور مذہبی اداروں کو ایسے لوگوں اور افکار سے پاک

کیا جائے جو پاکستانیوں کو گروہوں اور دھڑوں میں تقسیم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ جب تک یہ انتشار انگیز ایجنڈا اُکھاڑ کر نہ پھینکا جائے تب تک یہ پاکستانی قوم ایمان، اتحاد، تنظیم سے خالی رہے گی اور ترقی کی منزلیں ہم سے دُور رہیں گی۔

(عمیر احمد لمز کے طالب علم ہیں)

محمد عمر حبیب

بھوک

گرما گرم بحث جاری تھی کہ کھانے کے لیے کیا منگوایا جائے۔ انواع واقسام کے پکوانوں کے نام ایسے انداز میں پیش کیے جاتے رہے کہ سن کر منہ میں پانی آنے لگتا مگر ہر کھانے پر کوئی نہ کوئی ناک بھوں چڑھا کر اظہارِ ناپسندیدگی کرتا اور نتیجتاً وہ ڈش مسترد ہو جاتی۔ دروازے کے ساتھ چپکا نوکر بخشو منتظر تھا کہ کب ملک صاحب اسے بلا کر کسی ریستوران سے کھانا لانے کا کہیں اور وہ راستے میں دو چپاتیاں اور چٹنی کا پیکٹ کھسکا لے۔ ایک طرف ملک جمشید اور ان کے دوستوں کو کھانے کے لیے کچھ پسند نہیں آ رہا تھا جب کہ دوسری جانب بخشو کی آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں۔ لاٹھی کے سہارے نقل وحرکت کرنے والے اِس نحیف بوڑھے کے سر کے بال غائب تھے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، پیشانی پر اِس قدر شکنیں پڑ چکی تھیں کہ اگر کبھی وہ ناگواری سے چہرہ بگاڑ بھی لیتا تو اگلے شخص کو معلوم نہ ہوتا تھا۔ جسم پر گوشت نام کی چیز بمشکل دکھائی دیتی تھی اور ہڈیاں اندر تک دھنسی ہوئی تھیں۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا کسی نے بانس پر کپڑے لٹکا دیے ہوں۔ اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ ایک خداترس شخص اس کی حالت دیکھ کر کچھ مدد نہ کر سکتا تب بھی کم از کم ہمدردی کے دو بول ضرور بولتا، مگر خدا کی اس بستی میں ہمدرد روح افزا تو دستیاب تھا مگر ہمدرد انسان نایاب تھے۔ یہاں اظہارِ ہمدردی تو دور کی بات، اس کو سرِ راہ پا کر لوگ دوسری طرف دیکھتے ہوئے آگے نکل جاتے تھے۔ بعض اوقات جب وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوتا تو بچے اس کی لاٹھی اٹھا کر بھاگ جاتے اور وہ نماز توڑ کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ گالیاں دیتا ہوا اُن کے پیچھے بھاگتا۔ اُسے ایسی حالت میں گرفتار دیکھ کر لوگ

قہقہے لگاتے۔شاذ و نادر ہی ایسا ہوا کہ کسی شخص نے بچوں کو شرارت پر جھڑکا ہو۔ وہ جب محسوس کرتا کہ بچوں کو پکڑنا محال ہے تو تھک ہار کر سڑک پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ بچے بار بار اُس کے قریب آ کر لاٹھی دکھایا کرتے اور وہ اُن کی منتیں کیا کرتا۔ جب بچے اس کھیل سے اکتا جاتے تو لاٹھی اس کی جانب پھینک دیتے جس کے سہارے چلتا ہوا وہ واپس مسجد جاتا اور اپنی نماز لوٹاتا۔ایک مرتبہ ملک صاحب کے بیٹے نے لاٹھی کھینچ کر ماری تو وہ بخشو کے پاؤں پر جا لگی۔ ٹخنے میں شدید چوٹ آئی جس کے سبب اُس کے لیے چلنا دوبھر ہو گیا۔ اگلے دن جب وہ بچے کی شکایت کرنے ملک صاحب کے پاس گیا تو ملک صاحب کو پہلے ہی غصے سے بھرا پایا۔

’’میں نے سنا ہے کہ تم اکثر نماز توڑ دیتے ہو۔‘‘

’’مم۔۔۔میں۔۔۔‘‘ بخشو کے منہ سے کچھ نکل نہ پایا۔

’’صاحب جی! محلے کے لونڈے اِس کی سوٹی یا جوتا اٹھا کر بھاگ جاتے ہیں، اِس وجہ سے یہ نماز توڑتا ہے۔‘‘ کمالو مالی نے گملے کو پانی دینا چھوڑ دیا اور بخشو کی صفائی پیش کی۔

’’بک بک کرنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دے۔ ابھی تو تُو نے کیاریوں کی گوڈی بھی کرنی ہے۔‘‘ ملک صاحب نے اُس کی سرزنش کی اور پھر بخشو سے بولے: ’’بخشو! آج کے بعد اگر کبھی تو نے نماز توڑی تو پھر اس حویلی کا رخ نہ کرنا۔تو نے جمعے کے روز امام صاحب کا وہ خطبہ نہیں سنا جس میں وہ نماز توڑنے کا عذاب سنا رہے تھے؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیری نحوست سے ہمارے گھر پر بھی خدا کا عذاب نازل نہ ہو جائے‘‘ بخشو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ملک صاحب کو وہ بات بھی بتا دے جو انھوں نے بے نمازی کے متعلق کہی تھی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن بعد مسجد کا چکر لگانے والا یہ شخص پنج وقتہ نمازی بزرگ کو کوس رہا تھا مگر بخشو کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ ملک صاحب بولتے جا رہے تھے:

’’اگر بچے تمھارا عصا چراتے ہیں تو کیا ہوا؟ وہ تو معصوم ہیں۔ وہ یہ کام نماز میں تمھارا انہاک معلوم کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا تو نماز پڑھتے ہوئے کوئی میری ٹوپی اتار کر لے گیا۔ میں نے نماز نہیں توڑی بلکہ نماز کے بعد بازار سے نئی ٹوپی خرید لی۔‘‘ بخشو دل ہی دل میں اِس مضحکہ خیز مثال کی تُک ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ حضور! آپ کے پاس تو نئی ٹوپی لینے کے پیسے تھے۔مگر میرے پاس نئی سوٹی لینے کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟

مگر اُس کے لب نہ ہلے۔ اُس میں ہمت ہی نہیں تھی یا شاید وہ یہ پوچھ کر اپنی نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ وہ الفاظ کو دل سے نکل کر حلق میں پہنچنے سے پہلے ہی گھونٹ لیا کرتا تھا، اُس کا چہرہ تو ویسے بھی جذبات سے عاری تھا۔ شاید کوئی سمجھے کہ راوی نے غلو/غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور بخشو کو تو اپنے فعل پر ندامت ہو رہی تھی۔ مگر یہ اعتراض اُس وقت ختم ہوتا ہے کہ جب اِس رات گھر داخل ہوتے ہی وہ نفیسہ کے سامنے ملک صاحب کو اونچی آواز میں غائبانہ صلواتیں سنانا شروع ہو گیا۔ نفیسہ گھبرا گئی، اُس نے بیرونی دروازہ بند کر دیا اور بخشو کو پکڑ کر اندر کمرے میں لے آئی:

''جو بولنا ہے یہاں بولو۔ تم اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے کہ اگر کوئی سن لیتا تو قیامت ٹوٹ پڑتی۔''

''بی بی یہاں تو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ اُس ظالم تک آواز پہنچے۔''

''اگر اتنا ہی شوق تھا سنانے کا تو وہیں سنا کر آتے۔ یہاں بیچ صحن میں کھڑے ہو کر گالیاں بکنے کا کیا فائدہ؟ اگر دیواروں کو سنانا ہے تو یہیں کھڑے ہو کر تقریر جھاڑ لو۔'' نفیسہ کی جلی کٹی باتیں سننے کے بعد وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ بخشو ملک صاحب کے کھانے کے آرڈر کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر نصف گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد بخشو کو حکم ملا کہ اگر وہ جانا چاہے تو گھر جا سکتا ہے۔ ملک صاحب کھانا ایسے ہوٹل سے منگوا چکے تھے جن کی طرف سے کھانا گھر پہنچایا جاتا ہے۔

وہ کمرے سے نکلکر دروازے کے قریب سیڑھیوں پہ ہی ڈھے گیا۔ وہ پچھلے تین دن سے فاقے کر رہا تھا۔ صرف وہ ہی نہیں اُس کی بیوی بھی سوکھی روٹیاں حلق سے اتار کر گزارا کر رہی تھی جو زندہ رہنے کے لیے چبانے کے بجائے نگلی جاتی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ ہر ماہ کی آخری تاریخوں میں یہی حالت ہوتی تھی۔ ملک صاحب کا ایک عجیب اصول تھا کہ سینتیس روز بعد تنخواہ دیتے تھے۔ بخشو ان کے ہاں پچھلے دس سال سے ملازمت کر رہا تھا۔۔ اُس سے قبل جب اُس کے ہاتھوں میں جان تھی تو وہ ایک مل میں مزدوری کرتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد جب ملک صاحب نے تنخواہ کی ادائیگی میں تاخیر سے کام لیا تو ابتدا میں بخشو نے ایک دو بار ملک صاحب کی اِس روش پر احتجاج کیا۔ مگر ملک صاحب جواب دیتے کہ مجھے معلوم ہے کہ کب تنخواہ دینی ہے اور وہ چپ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اُس کے لیے نقاہت کے سبب چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اندر سے آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ملک جی بخشو کو کیا تنخواہ دیتے ہو؟''

''بس اتنی دیتا ہوں کہ اس کے پر نہ نکلیں۔''

''اچھی بات ہے، مہنگائی کا دور ہے۔ اگر ملازمین کی تنخواہ بڑھا دو تو اپنے لیے کچھ نہیں بچتا۔''

''میں بخشو کو ہمیشہ ایک ہفتہ دیر سے تنخواہ دیتا ہوں۔ اس طرح ہر چار مہینوں بعد ایک ماہ کی تنخواہ بچ جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا حافظہ کمزور ہے اور سوال نہیں کرتا۔'' ملک صاحب نے گویا کہ اپنا کارنامہ سنایا جس پر سب عش عش کر اٹھے۔

''میں بھی بچت کرتا ہوں مگر میرا طریقہ ذرا مختلف ہے۔''

بچت کا نام سنتے ہی بخشو نے فرش پر تھوک دیا اور بڑبڑایا: ''انسانوں کو مار کر تم رقم بچاتے ہو۔''

اندر سے آواز دوبارہ آنے لگی: ''کسی نوکر سے چھوٹا موٹا نقصان بھی ہو جائے تو میں پورے ماہ کی تنخواہ کاٹ لیتا ہوں۔ جب کبھی لمبا عرصہ کسی نوکر کی تنخواہ کاٹنے کا موقع نہ ملے تو میں خود کوئی شے توڑ کر خانساماں یا صفائی کرنے والے ملازم پر الزام دھر دیتا ہوں۔'' بخشو سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ چوہدری فلک شیر تھا جو کل ہی یکم مئی پر ریلی سے خطاب کرتے ہوئے مزدوروں کو ان کے حقوق سے آشنائی بخش رہا تھا۔ بخشو میں مزید سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور باہر چل دیا۔ وہ ایسے تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ کسی نے اُس کی ٹانگوں میں بجلی بھر دی ہو۔ لیکن اگر چند لمحے وہ اور وہاں رک جاتا تو جان لیتا کہ اس کے ساتھ کل کیا ہونے والا ہے۔

وہ سوچوں میں غلطاں و پیچاں تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا گھر کی جانب رواں دواں تھا کہ یکا یک اس کے سر پر کوئی بھاری چیز آ گری۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان برآمد ہوا مگر جب اس کی نظر زمین پر پڑی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ گنڈیریوں سے بھرا ہوا شاپر تھا۔ کچھ کو چوس لیا گیا تھا جب کہ بقیہ خراب تھیں۔ بخشو نے شاپر اپنی پھٹی ہوئی چادر میں ایسے چھپایا، گویا کوئی خزانہ ہاتھ لگا ہو۔

''چلو ایک رات مزید زندہ رہنے کا سامان مل گیا۔'' اس نے خود کلامی کی اور تیزی سے گھر کی جانب چل دیا۔

....

''اس کتے کو تو کھول دو، ورنہ یہ بھی ہمارے ساتھ بھوکا مر جائے گا۔ ہمارے پاس تو خود کھانے کو کچھ نہیں ہے، اسے کیا دیں؟'' بخشو ہاتھ میں تھامی گنڈیری کا رس نکالنے کی کوشش میں ناکام ہونے پر اسے ثابت ہی نگل گیا۔ اسے ایک زوردار کھانسی آئی مگر پیٹ کی آگ بجھانے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ تھا۔

''اگر اس نے کسی راہگیر کو کاٹ لیا تو؟'' نفیسہ نے استفسار کیا۔ اس وقت وہ بغیر چینی اور دودھ کے چائے بنا رہی تھی۔

گھر میں یہ دو نفوس ہی رہتے تھے کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔

''تو کیا ہوگا؟ اگر کسی کو کاٹ بھی بیٹھا تو خیراتی ہسپتال والے اُس بندۂ خدا کو اٹھا کر لے جائیں گے، کم از کم اُسے دو وقت کا کھانا تو مفت ملے گا۔ مر بھی گیا تو کوئی مسئلہ نہیں، غریب کا وجود اس دھرتی پر کسی بوجھ سے کم نہیں ہوتا۔ اس نے مرنا تو ویسے بھی ہے، کتے کے کاٹتے ہی مر جائے یا سسک سسک کر بھوک سے مرے۔''

''ضروری تو نہیں کہ کسی غریب کو ہی کاٹے۔''

''اگر کسی امیر کو کاٹے گا تب بھی کسی طبیب کا بھلا ہو جائے گا۔'' بخشو نے بے نیازی سے کہا۔ نفیسہ مزید بحث کرنا چاہتی تھی مگر اس کے تیور دیکھ کر خاموش رہی۔

....

بخشو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ آج ملک صاحب کے سینتیس دن کا مہینہ پورا ہو چکا تھا اور اسے تنخواہ ملنی تھی۔ نمازِ فجر ادا کر کے اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی جہاں ساڑھے سات کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ اس کو آٹھ بجے سے پہلے ملک صاحب کے گھر پہنچنا تھا جو بیس منٹ کی پیدل مسافت پر واقع تھا۔

''آج اتنی جلدی منہ دکھانا کیسے گوارا کر لیا؟'' جیسے ہی وہ ملک صاحب کے گھر داخل ہوا تو غیظ و غضب سے بھرپور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے کانوں نے سننے میں غلطی کی ہو۔ ملک صاحب کو اتنی غصے بھری حالت میں دیکھ کر معلوم نہیں اُسے دجال کیوں یاد آیا کرتا تھا۔ شاید اس بنا پر کہ اس حالت میں ان کی ایک آنکھ چھوٹی ہو جاتی جب کہ دوسری غصے سے پھڑکنے کی وجہ سے پھیل جاتی تھی جو ملک صاحب کے دبدبے

میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شکل پر رقص کرتی شیطانیت کو بھی بڑھا دیا کرتی تھی۔

''حضور میں تو ہمیشہ ہی وقت سے پہلے یہاں موجود ہوتا ہوں۔'' وہ سمجھا تھا کہ شاید اس کا قبل از وقت آنا ملک صاحب کو ناگوار گذرا ہے۔

''پورا آدھا گھنٹہ لیٹ ہے تو!''

بخشو نے بوکھلا کر دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا جو ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی جہاں کبھی ہمہ وقت گھڑی ہوا کرتی تھی مگر گردشِ حالات نے اسے گھڑی بیچنے پر مجبور کر دیا۔

''مجھے اس گھڑی کا وقت غلط معلوم ہوتا ہے، سرکار۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ وہ کبھی گھڑی کو دیکھتا تو کبھی ملک صاحب کو۔ ملک صاحب کے چہرے پر پورے بارہ بجے تھے جب کہ گھڑی پر ساڑھے آٹھ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید ملک صاحب کے چہرے کے وقت سے ملنے کے لیے گھڑی کی سوئیاں تیز حرکت کرنے لگ گئی ہیں۔

''ایک چوری اور اوپر سے سینہ زوری۔ میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں کہ تو مستقل لیٹ آ رہا ہے۔ تجھے راہِ راست پر لانے کے لیے جرمانے کے طور پر ایک ماہ کی تنخواہ ضبط۔'' ملک صاحب نے طیش کے عالم میں کہا اور کھڑے ہو گئے۔ دوسری ہی ساعت میں وہ اندر جا چکے تھے۔

بخشو اتنا پاگل نہ تھا کہ اس کھیل کو سمجھ نہ پاتا۔ ملک صاحب نے تو ایک کھلونا ٹوٹنے کا نقصان اٹھائے بغیر ہی بچت کر دکھائی تھی۔

''بچت۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل آیا۔ ایسی بھینس کا کیا فائدہ جو دودھ نہ دے، چنانچہ اس نے یہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اور نفیسہ آئندہ دنوں کی منصوبہ بندی کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ گھر میں جو کچھ بچا تھا، سب کچھ بیچنے کے بعد بھی دو وقتوں سے زیادہ کا گذارا محال تھا۔ ان کی حالت ایسی تھی کہ ابلے ہوئے گھاس کو ساگ سمجھ کر کھانے کو تیار تھے مگر ابالنے کے لیے لکڑیاں ندارد۔ گھر میں کسی دور میں چارپائیاں ہوا کرتی تھیں جو بیچ کر اب وہ فرش پر بوریا بچھا کر سویا کرتے تھے۔ اس حالت میں سوائے کچھ برتنوں کے گھر سے اور کیا نکلنے کی امید تھی؟ صرف یہ چار مرلے کا کچا آبائی

مکان تھا جوان کو سر چھپانے کے لیے میسر تھا۔

''کیوں نہ یہ زمین بیچ دی جائے؟'' نفیسہ نے بخشو کو مشورہ دیا۔

''بیچ تو دوں مگر پھر کہاں جا بسیں گے؟ زندہ مردے کو تو قبرستان میں بھی دو گز تک زمین نہیں ملتی۔'' بخشو نے سرد آہ بھری۔

''کہیں خالی جگہ پر جھونپڑی ڈال لیں گے۔''

''اب وہ دور گیا کہ جھونپڑی ڈالنے کے لیے مفت جگہ ملا کرتی تھی۔ اب تو کرائے پر مکان لینا پڑتا ہے اور کرائے اس طرح آسمان سے باتیں کر رہے ہیں کہ ہم ایک بار پھر کنگال ہو جائیں گے۔ اپنے گھر میں فاقوں سے مرنا، بے عزت ہو کر سرِ راہ مرنے سے بہتر ہے۔'' بخشو بولتا چلا گیا۔ نفیسہ خاموش ہو گئی۔

''اور ویسے بھی اس گھر کے دونوں طرف ملک صاحب کے مکان ہیں جو انھوں نے کرائے پر دے رکھے ہیں۔ ایک دور میں انھوں نے مجھے ڈرا دھمکا کر یہ مکان کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا چاہا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اور اب تو وہ کوڑیوں کے مول بھی نہ خریدیں کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ یہ بڈھا بڈھی چار دنوں میں مر جائیں گے۔ پھر پٹواری کو چند نوٹ دے کر مکان اپنے نام کروانا کون سا مشکل کام ہے۔ اور ویسے بھی علاقے میں ان کا دبدبہ اتنا ہے کہ ان کی ناراضگی مول لے کر کوئی بھی یہ مکان خریدنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔'' بخشو نے اپنی بات مکمل کی۔ اس کی آواز میں کڑواہٹ تھی، تمسخر تھا، بے بسی اور لاچاری تھی جسے نفیسہ نے بخوبی محسوس کر لیا۔

نفیسہ صحن کے کونے میں لگے نلکے سے پانی نکال کر گھڑا بھر رہی تھی۔ جن دنوں بجلی کی سہولت میسر تھی، بخشو نے کئی بار نلکا نکلوانے کا سوچا تھا۔ مگر ہمیشہ سستی آڑے آئی اور اب بجلی کا کنکشن کٹنے کے بعد وہی نلکا کام دے رہا تھا۔

''جس طرح خدا نے پانی کو پینے کے لیے بنایا ہے، اسی طرح اگر مٹی کو بھی غذا بنا دیتا تو شاید کوئی شخص بھوکا نہ مرتا۔'' بخشو نے درد بھرے انداز میں کہا۔

''ناشکری نہ کر، ورنہ خدا یہ نعمتیں بھی چھین سکتا ہے۔''

''خدا پانی چھین کر ہمیں کربلا میں ہی بھیج سکتا ہے۔ کم از کم شہید تو کہلائیں گے۔ ورنہ فاقوں سے مرنے

والے کی ڈھانچہ نما لاش کا چہرہ دیکھ کر لوگ ڈر جاتے ہیں اور اس کے چہرے کی وحشت کو جہنم کے فرشتوں کے خوف سے تعبیر کرتے ہیں۔'' جاہل بخشو فلسفیانہ انداز میں نفیسہ کو سمجھا رہا تھا۔نفیسہ کو اور تو کچھ نہ سوجھا، کمرے میں چلی گئی۔

....

جمعے کے خطبے کے دوران بخشو تیسری صف میں بیٹھا تھا۔مولوی صاحب کہہ رہے تھے:''انسان بے حد ناشکرا ہے۔اس کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔کیا تم نے کبھی کسی انسان کو بھوک سے مرتے دیکھا ہے؟''

''بھوک سے بیشک کوئی نہ مرتا ہو، مگر فاقوں سے سسکتی موت بہت لوگ مرتے ہیں۔'' بخشو نے خود کلامی کی۔

''کچھ کہا؟'' ساتھ سے آواز آئی۔بخشو نے چونک کر دیکھا تو بوسکی کے سوٹ میں ملبوس ملک صاحب نظر آئے۔بخشو کچھ نہ بولا۔نفرت کی شدت سے اُس کی رنگت غیر ہو گئی۔اس کے منہ میں کڑواہٹ عود کر آئی۔وہ تھوکنے کی غرض سے صف سے اٹھ کر وضوخانے کی جانب لپکا۔اور تھوکنے کے بعد ملک صاحب سے اِس قدر دور جا بیٹھا کہ جتنا ممکن تھا۔

نماز مکمل کر کے بخشو مسجد کے دروازے سے نکلا ہی تھا کہ ملک صاحب نے اسے روک لیا۔شاید وہ اُسے ہی تاکتے پھر رہے تھے۔بخشو کا دل چاہا کہ وہ نکل بھاگے اور کسی ایسی دنیا میں چلا جائے جہاں کبھی ایسے غلیظ چہرے سے سابقہ نہ پڑے۔مگر پھر اُس نے ملک صاحب کی بات سننے میں عافیت جانی۔

''بخشو تم اس دن سے ایسے ناراض ہوئے کہ پھر پلٹ کے ہمارے گھر کا رخ تک نہ کیا۔'' ملک صاحب نے کہا۔بخشو دور سے آتے ہوئے کوڑا اکٹھا کرنے والے ٹرک کو دیکھ رہا تھا۔''اس دن تم تو ناراض ہو کر چلے آئے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ گھڑی خراب ہے۔'' ملک صاحب کا لہجہ معذرت طلب تھا۔بخشو کو لگا کہ شاید ملک صاحب اسے نوکری پر بحال کرنا چاہتے ہیں۔

''بات یہ ہے بخشو کہ پچھلے انتخابات تک میرے تایا جی کونسلر کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوتے تھے مگر اب ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری مجھ پر آ گئی ہے۔تم تو جانتے ہو کہ اس علاقے کی جتنی خدمت ہمارے خاندان نے کی ہے، کوئی اور اس کا رتی برابر حصہ بھی نہیں کر پایا۔'' ملک صاحب ڈھٹائی کے ساتھ بولتے جا رہے تھے۔''یہ صاف

ستھری گلیاں خاکروبوں کے ساتھ ہماری دن رات کی مغزماری کی مرہون منت ہیں، ورنہ شمس آباد کی مثال تمھارے سامنے ہے جہاں ہر طرف گندگی پھیلی ہوتی ہے۔''

''ملک صاحب آپ کی اس صفائی مہم نے ہمارا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ جب سے گھر گھر کوڑا اکٹھا کرنے والا ٹرک آنے لگا ہے، لوگ اپنا بچا کچا کھانا اور گلے سڑے پھل گلی میں پھینکنا چھوڑ چکے ہیں اور مجھے اپنی غذا کی تلاش کے لیے شمس آباد جانا پڑتا ہے۔'' بخشو نے کہا اور ایک جھٹکے میں چل دیا۔ ملک صاحب کتنی ہی دیر وہاں ساکت وجامد کھڑے رہے۔ فلک بھی محوتماشا تھا کہ علاقے کا وہ سب سے بڑا کاروباری شخص، جسے دیکھ کر مسجد کے امام صاحب تک نیم سجدے کی حالت میں جھک جایا کرتے تھے، آج ایک نیچ ذات کے نوکر کے ہاتھوں ذلیل ہوا تھا۔ اُس کا سارا رعب ودبدبہ زمین بوس ہوگیا۔ ایک طرف جذبۂ ناکامی اس کو ملامت کر رہا تھا، جب کہ دوسری جانب اس کا خون بھی کھول رہا تھا۔ وہ اپنا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔ آخر اس نے غصہ تھوک کر بخشو کو منانے کا سوچا کیونکہ آخر دو ووٹوں کا مسئلہ تھا۔

''ایک بار الیکشن ہو جائیں۔ پھر اِس کمینے سے نبٹوں گا۔'' ملک صاحب نے خود کلامی کی۔

....

ملک صاحب بخشو کے گھر آئے اور معاملہ اس طرح طے پایا کہ نہ صرف بخشو کی نوکری بحال ہوئی بلکہ ساتھ میں ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ بھی دی گئی۔ بخشو تو اِس مصالحت کے لیے ہرگز تیار نہ تھا مگر یہاں بھی ایک حوّا موجود تھی جو دانۂ گندم کے حصول کے لیے اپنے شوہر سے ایک ناپسندیدہ کام کروانے کے گُر سے واقف تھی۔ نفیسہ نے بخشو کو منا ہی لیا۔ الیکشن کا دن آیا اور گذر گیا۔ اطلاعات کے مطابق ووٹوں کی گنتی کا عمل جاری تھا۔ ملک صاحب چند دوستوں کے ہمراہ اپنے دیوان کھانے میں تشریف فرما تھے۔ مقابل حریف پر پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔ مگر ملک صاحب بڑی توجہ سے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہرے تفکر کی لکیریں تھیں۔ جب بخشو چائے لے کر اندر داخل ہوا تو سامنے لگی چوبیس انچ کی ایل سی ڈی پر نتائج کا اعلان ہو رہا تھا۔

''اور حلقہ نمبر بائیس میں چوہدری وسیم نے انیس ووٹوں کی برتری کے ساتھ ملک جمشید کو ہرا دیا۔'' اعلان کا

ہونا تھا کہ ملک صاحب کرسی پر لڑھک گئے اور تھوڑی دیر بعد جب مسجد کے سپیکر سے اعلان ہو رہا تھا کہ ملک جمشید دل کا دورہ پڑنے پر دنیا سے کوچ کر چکے ہیں، اس وقت بخشو دوڑتا ہوا مولوی صاحب کے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ وہ مولوی صاحب کو بتانا چاہتا تھا کہ ان کی بات غلط تھی، آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو بھوک سے مرتے دیکھا ہے۔ ہاں اقتدار کی بھوک سے۔

(محمد عمر حبیب لمز کے طالب علم ہیں)

فضا عارف

تلاش

موسم بہت سہانا تھا، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی سرخی چارسو پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے درختوں پر بسنے والے پرندے اپنے گھونسلوں میں لوٹ آئے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، پتوں کی سرسراہٹ اور بہتے دریا کا شور مل جل کر عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ وہ اس دلچسپ موسم سے بے خبر دریا کے کنارے بینچ پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ ایک عجیب تذبذب کا شکار تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ دنیا کے سب لوگ جھوٹے ہیں یا واقعی وہ اس چیز کو پانے کا اہل نہیں جس کی اسے تلاش تھی۔ اس خوشگوار موسم میں بھی اسے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

شایان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اکلوتا ہونے کے ناطے وہ بہت لاڈلا تھا۔ اس کے والد کا بزنس پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے والدین اس کی ہر خواہش اور ضرورت پوری کرنے کو اپنی اولین ترجیح سمجھتے تھے۔ شایان نے شروع سے ہی بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ حال ہی میں اس کا داخلہ ملک کی بہترین یونی ورسٹی میں ہوا تھا۔ پیسے کی ریل پیل اور بے جا لاڈ پیار بھی اسے بگاڑ نہ سکے۔ وہ بہت فرماں بردار اور سب سے محبت کرنے والا بچہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے والدین اور عزیز رشتہ دار سب اس سے بہت خوش تھے۔

یوں تو اس کے بہت سے دوست تھے لیکن علی اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کے والد بہت محنتی آدمی تھے۔ وہ ایک سرکاری اسکول میں استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نجی ادارے میں ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو

اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔علی کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتا تھا۔اس نے شروع سے ہی وظیفے پر تعلیم حاصل کی تھی۔وہ صوم وصلوۃ کا پابند تھا۔اسے اپنے والد کی مشقت کا احساس تھا۔وہ ان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔اس مقصد کے لیے جب اس نے اپنے والد سے پارٹ ٹائم جاب کی بات کی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ابھی وہ اپنی پوری توجہ تعلیم کو دے۔علی کو اپنا دین سیکھنے کا بہت شوق تھا۔اس لیے جب وہ عصر کی نماز کے بعد قاری صاحب سے پارہ پڑھنے جاتا تو ان سے ڈھیروں سوال کرتا۔

علی سے شایان کی ملاقات پانچویں جماعت میں ہوئی جب اس کے والد کا تبادلہ کراچی میں ہوا۔رفتہ رفتہ ان دونوں کی دوستی گہری ہوتی گئی۔دونوں ساتھ پڑھائی کرتے اور فارغ اوقات میں کبھی کرکٹ کھیلنے گراؤنڈ کا رخ کرتے اور کبھی چہل قدمی کے لیے دریا کے کنارے نکل جاتے۔ان کی دوستی پورے سکول میں مشہور تھی۔یہ علی ہی تھا جس کی وجہ سے شایان کو بھی دین میں دلچسپی محسوس ہونا شروع ہوئی۔علی جب بھی قاری صاحب سے کوئی نئی بات سیکھ کر آتا تو شایان کو ضرور بتاتا اور شایان کو اگر کبھی دین کے معاملے میں کوئی سوال پریشان کرتا تو وہ علی کے پاس ہی جاتا۔اگر علی کو اس سوال کا جواب نہ آتا تو وہ قاری صاحب سے پوچھ کر اسے بتا دیتا۔

زندگی یونہی ہنستے کھیلتے گزرتی رہی۔ان کی دوستی کے تین سال اس تیزی سے گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔پھر ایک دن علی کے والد صاحب کے تبادلے کی خبر دونوں پر بجلی بن کر گری۔دونوں اس دن بہت اداس تھے۔اس شام بھی وہ دونوں دریا کنارے بیٹھے تھے۔

’’اب تو final exams میں صرف دو ہی مہینے بچے ہیں۔exams کے بعد چلے جانا۔‘‘ شایان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ علی اس کو چھوڑ کر جائے۔

’’میں بھی نہیں جانا چاہتا شایان! لیکن میں رک بھی تو نہیں سکتا نا۔ابو کو میری ضرورت ہے اور ویسے بھی وہاں جاتے ہی میں کسی اسکول میں ایڈمیشن لے لوں گا۔ڈونٹ وری۔‘‘ علی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔دونوں کے چہروں پر اداسی نمایاں تھی۔تھوڑی دیر کے لیے مکمل خاموشی چھا گئی۔علی نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

’’اداس مت ہو شایان، میں کوشش کروں گا کہ تم سے ملنے آؤں اور تم بھی جب چاہو مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔‘‘

علی نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

دونوں ہی جانتے تھے کہ یہ بات کہنے میں جتنی آسان لگ رہی تھی درحقیقت اتنی آسان تھی نہیں۔ جہاں علی کے والد صاحب کا تبادلہ ہوا تھا وہ جگہ اس شہر سے آٹھ گھنٹے کی مسافت پر تھی اور ملک کے حالات کے پیش نظر دونوں کے والدین ہی انھیں اتنی دور اکیلے سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے، اور نہ ہی ان کے والدین کے پاس اتنا وقت تھا کہ ان کے ساتھ جاسکتے۔

آخر وہ دن آہی گیا جب دونوں کو جدا ہونا تھا۔ وہ علی کا اسکول میں آخری دن تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ آج کے بعد وہ لمبے عرصے تک نہ مل سکیں گے یا پھر شاید کبھی مل ہی نہ سکیں۔ دونوں آخری مرتبہ بغل گیر ہوئے۔ جدا ہوتے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آخر علی اپنے خاندان والوں کے ہمراہ بہت ساری یادیں لیے وہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ دونوں میں رابطے کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ گوکہ شایان کے پاس موبائل فون تھا مگر علی کے والد صاحب کے پاس اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اسے موبائل فون لے کر دے سکتے اور علی یہ بات جانتا تھا اس لیے اس نے کبھی فرمائش نہیں کی۔ وہ اپنے والدین کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شایان چاہتا تھا کہ وہ علی کو موبائل فون تحفے میں دے مگر اسے معلوم تھا کہ علی کبھی اتنا مہنگا تحفہ قبول نہیں کرے گا۔

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے۔ بہار اپنی تمام تر شوخیاں سمیٹ کر رخصت ہوئی اور خزاں نے اپنی اداسیوں سمیت ڈیرہ جمالیا۔ دیواروں پر لگے پرانے کیلنڈر اترے اوران کی جگہ نئے کیلنڈروں نے لے لی۔ شایان نے اولیولز شاندار گریڈز سے پاس کرلیا اوراے لیولز میں پروموٹ ہو گیا۔

یوں تو وہ علی کو اکثر یاد کرتا مگر جب کبھی اسے دین کے بارے میں کوئی سوال کرنا ہوتا تب اسے علی بہت یاد آتا۔ اسے یاد تھا کہ علی کتنی توجہ سے اس کی بات سنتا اور کتنے پیار سے اسے سمجھاتا۔ علی کے جانے کے بعد اس کے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ ایک دن اسے خیال گزرا کہ کیوں نہ کسی مسجد کے امام صاحب سے رابطہ کیا جائے۔ آخر علی بھی تو کسی مسجد ہی میں جاتا تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ مسجد ضرور جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں اسے

اس کے سوالوں کے جواب ضرور ملیں گے۔

چھٹی کا دن تھا۔شایان رات دیر تک کمپیوٹر استعمال کرتا رہا تھا اس لیے صبح دیر سے اٹھا۔ناشتہ کر کے وہ تیار ہوا اور چہل قدمی کرنے کے لیے باہر نکل گیا۔اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔یہ ٹی شرٹ اس کے ابو پچھلے ہفتے ہی امریکا سے لائے تھے۔اس پر اس کے پسندیدہ ایکٹر کی تصویر تھی۔اسے یہ شرٹ بہت پسند تھی۔تھوڑی دیر میں مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔وہ رک گیا۔اس نے کچھ سوچ کر مسجد کا رخ کیا۔سب لوگ ایک جگہ اپنے جوتے اتار کر اندر داخل ہو رہے تھے۔اس نے بھی وہاں اپنے جوگرز اتارے اور اندر داخل ہو گیا۔ابھی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا کہ شلوار قمیض میں ملبوس ایک بڑے میاں اس کی جانب بڑھے۔

''ہیلو،'' شایان نے بڑے میاں سے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔بڑے میاں نے ایک نظر اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور ایک نظر اس کی شرٹ کی طرف۔پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر بولے:

''یہ مسجد ہے میاں تمھارا کوئی کلب نہیں جہاں اس طرح کی شرٹ پہن کر آؤ۔تمھیں معلوم نہیں تصویر والی جگہ پر نماز پڑھنا جائز نہیں اور تم مسجد میں ہی تصویر والی شرٹ پہن آئے ہو۔اپنی تو نماز خراب کی ہی، ساتھ میں دوسروں کی بھی کی۔معلوم نہیں آج کل کے والدین کو کیا ہو گیا ہے۔اپنے بچوں کو فر فر انگریزی تو بچپن سے ہی سکھا دیتے ہیں۔لیکن اتنے بڑے ہو جاتے ہیں تو بھی انھیں دین کی ایک بات نہیں سکھاتے۔لاحول ولاقوۃ۔'' یہ کہتے ہوئے بڑے میاں آگے بڑھ گئے۔

شایان حیران پریشان کھڑا رہا۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔اسے ان بڑے میاں کے رویے پر بہت رنج ہوا تھا۔اس سے آج تک کسی نے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی اور کوئی کرتا بھی کیوں؟ شایان تھا ہی اتنا سلجھا ہوا۔سب سے محبت کرنے والا، سب کی بات ماننے والا۔وہ نہ جانے اور کتنی دیر تک یونہی کھڑا رہتا اگر کوئی اسے آواز دے کر یہ نہ کہتا کہ مسجد کی صفائی کا وقت ہو گیا ہے اور اب اسے جانا پڑے گا۔وہ جوگرز پہن کر باہر نکل گیا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔اس رات اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔اس

کے والدین اس کے اس رویے پر بہت پریشان ہوئے کیونکہ اس نے آج تک ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ اگلی صبح وہ بخار میں تپ رہا تھا۔ اس کے والد نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک کرنے کے بعد آرام تجویز کیا اور اسے نیند آور گولیاں دے دیں۔ شایان کے والد کے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اس نے کسی بات کی بہت زیادہ ٹینشن لے لی ہے۔ اے لیولز کے امتحان قریب تھے۔ اس کے والدین کو لگا کہ شایان پڑھائی کی وجہ سے فکرمند ہے کیونکہ وہ امتحانوں کیبارے میں اکثر پریشان ہو جاتا تھا۔ شایان نے بھی یہی ٹھیک سمجھا کہ والدین کو کچھ نہ بتایا جائے کیونکہ وہ انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دن گذرتے گئے۔

جمعے کا دن تھا۔ اس کے ایک دوست نے اسے اپنے ہاں دعوت پر بلایا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق جینز شرٹ پہنی اور گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔ جامعہ مسجد کے قریب سے گذرا تو اس نے گاڑی روک دی۔ وہ گاڑی سے نکلا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ ایک دم اسے کچھ یاد آیا اور وہ رک گیا۔ اس نے جھک کر اپنی شرٹ کی طرف دیکھا اور اسے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ اس کی شرٹ پر کوئی تصویر نہیں تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ امام صاحب کی طرف بڑھا۔ وہ بہت سے لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ اتنے میں ایک صاحب نے اسے مخاطب کیا۔ شایان انھیں ''ہیلو'' کہنے ہی والا تھا کہ اسے پچھلا واقعہ یاد آیا۔

''السلام علیکم،'' شایان نے جلدی سے کہا۔

''وعلیکم السلام،'' ان صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے بغور دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

شایان نے بھانپ لیا کہ یہ ملاقات بھی پچھلی سے کچھ بہتر نہ ہوگی اور وہ صحیح تھا۔ اس بار اسے جمعے کے دن بھی جینز شرٹ پہن کر آنے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

''پینٹ شرٹ تو پورا ہفتہ پہنی جا سکتی ہے۔ انسان جمعے کو بھی شلوار قمیض نہ پہنے تو کیا فائدہ۔'' وہ صاحب اپنے طنزیہ جملوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور شایان بت بنا کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔

''میرا مقصد تو سمجھانا تھا سو میں نے سمجھا دیا، آگے تمھاری مرضی۔'' کہتے ہوئے وہ صاحب چلے گئے۔

شایان کو اچانک یاد آیا کہ اسے تو امام صاحب سے ملنا تھا۔ اس نے اس سمت نظر دوڑائی جہاں امام صاحب

کھڑے تھے تو اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ امام صاحب جا چکے تھے۔ وہ مسجد سے باہر نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے موبائل فون چیک کیا۔ اس کے دوست کمال کی سات مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے گاڑی سٹارٹ کی اور چل پڑا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ لیٹ پہنچا تھا۔ سب بہت خفا ہو رہے تھے۔ اس نے سب سے معذرت کی۔ وہ پارٹی کے دوران بھی کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ کمال نے فوراً یہ بات محسوس کی۔ وہ شایان کے والد سلیم صاحب کے دوست اور بزنس پارٹنر اکرم صاحب کا بیٹا تھا اور شایان کو بچپن سے جانتا تھا۔ شایان جو بھی محسوس کر رہا ہوتا تھا وہ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو جاتا تھا۔ اس نے شایان سے پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ شایان جلد ہی پارٹی چھوڑ کر باہر آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کچھ دیر اور وہاں رکا تو کمال اور اس کے باقی دوست ضرور اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھیں گے اور وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور نہ ہی اسے بات چھپانی آتی تھی۔ اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ وہاں سے چلا جاتا۔

اے لیولز کے امتحان آ گئے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بہت محنت کی تھی اور اس کے امتحان بھی اچھے ہوئے تھے۔ اب اسے نتائج کا انتظار تھا اور آخر نتائج آ گئے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح شاندار گریڈز لیے تھے۔ اس کے والدین اس سے بہت خوش تھے۔ وہ خود بھی بہت خوش تھا۔ اب اس نے مختلف یونی ورسٹیوں میں اپلائی کرنا شروع کر دیا اور جلد ہی اس کا داخلہ ملک کی بہترین یونی ورسٹی میں ہو گیا۔

رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ یونہی بیٹھا بے مقصد ٹی وی کے چینلز تبدیل کر رہا تھا کہ ایک چینل پر جا کر رک گیا۔ اس چینل پر اس رمضان شروع ہونے والے قرآن پروگرام کا اعلان ہو رہا تھا۔ اسے علی کی بات یاد آئی۔

''شایان! قرآن پاک اس کا کلام ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ تو ہم کیوں نہ جانیں کہ ہمارا خالق ہم سے کیا کہہ رہا ہے؟''

شایان کا دل چاہا کہ وہ بھی جانے قرآن پاک میں اس کے خالق نے کیا فرمایا ہے۔ وہ کمرے سے نکلا، گاڑی کی چابی پکڑی اور پورچ سے گاڑی نکال کر ٹی وی پر بتائے پتے کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ کوئی مدرسہ تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ وہاں سفید شلوار قمیض میں ملبوس بچے ایک قطار میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک قاری صاحب بیٹھے

انھیں قرآن پاک پڑھا رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بچوں کو سبق دے کر قاری صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''السلام علیکم،'' قاری صاحب نے کہا۔

''وعلیکم السلام،'' شایان نے جواب دیا۔

شایان نے انھیں بتایا کہ وہ ان کے قرآن پروگرام میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ قاری صاحب نے اسے اوقات سے آگاہ کیا اور یکم رمضان کو آنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد وہ گھر واپس آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ آخر اسے وہ ملنے والا تھا جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔

آج یکم رمضان تھا۔ شایان ظہر کی نماز کے بعد مدرسے کی جانب روانہ ہوا۔ وہ اڑ کر وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آج بھی وہ معمول کے مطابق جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ مدرسے میں داخل ہوا۔ ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے تھے۔ اس لیے اسے آگے ہی جگہ مل گئی۔ کچھ دیر بعد قاری صاحب آ کر اپنی جگہ پر براجمان ہو گئے۔ انھوں نے پورے مجمعے کو دیکھا اور ایک اچٹتی نگاہ شایان پر ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے درس شروع کر دیا۔ وہ بہت توجہ سے قاری صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ عصر کے قریب درس ختم ہو گیا۔ سب اٹھ کر نماز کی تیاریوں میں لگ گئے۔ کوئی صفیں سیدھی کر رہا تھا اور کوئی اذان کی تیاری میں مصروف تھا۔ باقی لوگ وضو کرنے چلے گئے۔ شایان بھی ان میں شامل تھا۔ نماز کے بعد وہ نکلنے ہی والا تھا کہ قاری صاحب نے اسے آواز دے کر روکا۔ وہ پلٹا اور قاری صاحب کے پاس پہنچا۔

''بیٹھو،'' قاری صاحب نے کہا۔ ان کا لہجہ کسی بھی قسم کے جذبات سے خالی تھا۔

وہ قاری صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اگلے ہی لمحے اسے قاری صاحب کے الفاظ اس پر بم گراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب کی بار پھر اس کے ظاہری حلیے سے اس کے باطن کو پرکھا جا رہا تھا۔

''یہ مدرسہ ہمارے بزرگوں کی برسوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کسی کی مغربی ذہنیت کا یہاں کے طلبا پر کوئی منفی اثر پڑے۔'' قاری صاحب سپاٹ لہجے میں بولتے جا رہے تھے اور شایان حیران پریشان قاری صاحب کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔

شایان کو اپنے اندر آندھیاں سی چلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ علی کی باتوں سے اس نے اپنے ذہن میں قاری صاحب کی صورت میں ایک شفیق اور مہربان استاد کا جو بت بنا رکھا تھا وہ آج چکنا چور ہو گیا تھا۔ اسے ایک دم سے علی کی ساری باتیں کسی افسانوی کردار کا حصہ لگنے لگیں۔

''اچھا اب تمھیں بھی چلنا چاہیے۔ افطار کا وقت قریب آ رہا ہے۔'' قاری صاحب یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

شایان کا اب وہاں رکنا بے مقصد تھا۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چند ساعتیں وہ یونہی بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر جانے کی بجائے ساحل سمندر کا رخ کیا۔ وہ اور علی اکثر یہاں آیا کرتے اور دریا کنارے بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے۔ علی کے جانے کے بعد بھی جب کبھی اسے علی کی یاد آتی تو وہ یہاں آ جاتا اور پرانے دن یاد کیا کرتا۔ سمندر کے کنارے وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور پھر سوچوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسے علی کی بات یاد آئی۔

''دین بہت آسان ہے شایان! بس ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔''

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جس دین کی بات علی کر رہا تھا؛ کیا باقی سب بھی اسی کی بات کر رہے تھے یا کسی اور دین کی؟ اگر دونوں دین ایک ہی ہیں تو علی کی اور باقی سب کی باتوں میں اتنا فرق کیوں؟ اس کے لیے دین اتنا مشکل کیوں ہے؟ وہ اسی طرح کے ڈھیروں سوالوں میں الجھا کسی جواب کی تلاش میں تھا لیکن جتنا وہ سوچتا جا رہا تھا، اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ایک دم کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایک باریش بزرگ نظر آئے۔ اسے اپنے پچھلے دونوں تجربات یاد آئے۔ وہ گھبرا گیا۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔

''بیٹا! افطار کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ اس وقت تو آپ کو گھر ہونا چاہیے؟''

ان بزرگ کی محبت بھری آواز اس کو کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوئی۔

’’وہ۔۔۔میں۔تو۔۔۔بس۔۔۔‘‘ شایان سے کوئی جواب نہ بن پایا۔

’’اب تو افطار میں بس چند ہی منٹ باقی ہیں۔آپ ایسا کریں میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ ہمارے ساتھ افطار کریں۔اس کے بعد گھر چلے جانا۔‘‘ ان بزرگ کا لہجہ اتنا شفقت بھرا تھا کہ شایان انکار ہی نہ کر پایا اور چپ چاپ ان کے ساتھ چل دیا۔

یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔جس میں دو کمرے، ایک مہمان خانہ، ایک باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ تھا۔ان بزرگ نے شایان کو مہمان خانے میں بٹھایا اور خود افطاری کا سامان لینے اندر چلے گئے۔انھوں نے زمین پر دسترخوان لگایا اور اس کے سامنے افطاری کا سامان لگا دیا۔افطار سے فارغ ہو کر وہ بزرگ شایان کی طرف متوجہ ہوئے۔’’ہاں تو بیٹا آپ بتائیں آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے۔ہم مل کر اس کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔‘‘ شایان کو ان بزرگ کی اس بات پر بالکل کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ اس کے اندر کی کیفیات کی عکاسی کرتا تھا۔

شایان نے شروع سے آخر تک انھیں ساری بات مختصر الفاظ میں بیان کی۔وہ بزرگ ہلکا سا مسکرائے۔

’’اچھا تو یہ بات ہے۔دیکھو بیٹا! دین ایک مکمل صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ہمیں بس سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک آسانی کا تعلق ہے تو دین واقعی بہت آسان ہے۔ یہ تو لوگوں کے رویے ہیں کہ وہ اسے اس صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ہمیں دین مشکل لگنے لگتا ہے۔بس بیٹا! آپ کو اپنی تلاش جاری رکھنی ہے۔لگن سچی ہو، حوصلے بلند ہوں تو یہ چھوٹی موٹی رکاوٹیں انسان کو منزل مقصود پر پہنچنے سے نہیں روک سکتیں۔آپ سمجھ رہیں ہیں نا میری بات؟‘‘

شایان نے اثبات میں سر ہلایا۔

بزرگ نے اپنی بات جاری رکھی۔’’اور جہاں تک بات ہے لوگوں کے منفی رویے کی تو ہر انسان میں کچھ مثبت پہلو ہوتے ہیں کچھ منفی۔آپ کو ان کا وہ مثبت پہلو دیکھنا ہے اور اس سے سیکھنا ہے اور منفی پہلو کو نظر انداز کرنا ہے۔اور ہو سکے تو اپنے اچھے رویے سے اس کو بدلنے کی کوشش کرنی ہے۔‘‘

''لیکن میں۔۔۔میں کیسے کسی کو تبدیل کر سکتا ہوں۔'' شایان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''دیکھو بیٹا! انسان کو اشرف المخلوقات یونہی نہیں بنایا گیا۔ ہر انسان میں بہت کچھ کر گزرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جو یہ صلاحیت پہچان جاتے ہیں، وہ ترقی کی منازل طے کرتے جاتے ہیں اور جو تھک کر حوصلہ ہار جاتے ہیں اور کوشش ترک کر دیتے ہیں، وہ یہ صلاحیت نہیں پہچان پاتے اور ناکام رہتے ہیں۔''

اسے علی کی بات یاد آئی۔ ''انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور بس کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ انسان کے ہاتھ میں صرف کوشش ہے اور اس کا ثمر صرف خدا کے پاس۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان کوشش کرے اور اس کا ثمر نہ پائے۔''

''مغرب کی جماعت کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز پڑھ کر آپ کو جلد از جلد گھر چلے جانا چاہیے۔ آپ کے والدین پریشان ہوتے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساتھ ہی شایان بھی کھڑا ہو گیا۔ اسے آج عجیب سی راحت محسوس ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی برسوں کی تلاش آج ختم ہو گئی تھی۔ اسے اپنی منزل بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی ہمت نہ ہارے گا اور نہ ہی کبھی کوشش ترک کرے گا۔

(فضا عارف لمز کی طالبہ ہیں)

عائشہ شبیر

اپنے اپنے طوفان

ہوا اتنی تیز تھی کہ بادلوں کو بھگا کر سورج کے سامنے لاتی اور لے جاتی جیسے چھوٹے بچے چھپن چھپائی کھیلتے ہوئے بھاگتے اور رُکتے ہیں۔ درختوں پر پتے ایسے کھلکھلاتے جیسے عید پر خاندان مل بیٹھ کر ہنستا ہے۔ پرندے ہوں، کھلکھلاتی کلیاں یا میری ذات ہر شے ایک پراسرار مسرت کی آغوش میں محوِ خواب تھی۔ بہار آئی مگر گرمی بھی جلد ہی اس کے پیچھے بھاگ آئی۔ ہمارے یہاں یہ موسم جدائی نہیں سہتے۔ بیچ میں ایسے دن بھی ہوتے ہیں کہ ایک دن سرد اور ایک دن شدید گرمی۔ دن گرم اور راتیں سرد، بارش اور ساتھ ہی تیز دھوپ۔

جیسے یہ موسم آپس میں کھیلتے ہیں ایسے ہی میرا دماغ بھی میرے جذبات کے ساتھ کھیلتا ہے۔ کسی دن کچھ اور کسی دن کچھ۔ موسم اور موڈ ملتے جلتے ہی ہیں۔ کبھی ذہن میں آندھی چلتی ہے اور گرد و غبار میں لپٹے ہوئے خیالات دماغ کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ جاتے ہیں اور کبھی دھیمی دھیمی بارش ایک چیز پر سارا دن لگا تار گر گر کر دماغ کو اتنا بھاری کر دیتی ہے کہ احساسات بھی سن ہو جاتے ہیں۔ انتہا کی خوشی اور انتہا کا غم، کیا ایسے نہیں جیتے؟

یہ کہانی صرف میری نہیں اس کی بھی ہے، اس کا اور میرا ایک عجیب سا رشتہ ہے۔ کھوکھلا بھی اور گہرا بھی۔ ہم ساتھ بھی ہوں تو اکیلا پن ہی محسوس کرتے ہیں۔ شاید یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کوئی پیار اور پیاس کا فرق نہیں جانتا۔ کوئی کسی کے پیچھے نہیں بھاگتا، تعلق اوپری سطح تک ہی رہتے ہیں۔ اپنے خوابوں کی گھنی جھاڑیوں میں ہم علاحدہ علاحدہ چل رہے ہیں۔

جب میں پہلی دفعہ اس سے ملی تھی تو دھوپ کے نیچے اپنی ہی بارش میں بھیگی ہوئی تھی اور وہ سائے کی پرسکون

آغوش میں تھا۔ میں نے زیب کی کوئی چیز اس سے لینی تھی۔ میرے اندر کا طوفان اتنی دیر سے بھڑک رہا تھا کہ اب میں نے اس کی آنکھ میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس جگہ سے پہلے مجھے طوفان نظر آرہا تھا۔ اور پھر اس کی مسکراہٹ اور دھیمی آواز سن کر مجھے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ یہ سکون اس کی آواز کے ساتھ ہی میرے کانوں کے ذریعے میرے اندر گیا اور میرے پورے جسم میں پھیل گیا۔ میں نے گہری سانس لی اور کچھ لمحات کے لیے میرا طوفان رک گیا۔ میں نے اپنے دوستوں کے اندر اس سکون کی تلاش میں کافی وقت گزار دیا لیکن وہ احساس مجھے دوبارہ نہ مل سکا۔ پھر جب ہماری دوستی ہوئی تو میں نے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ رہ کر میرے موسم تھوڑے رحم دل ہو گئے۔ میرے اندر نئے خیالات ایسے اگنے لگے جیسے بہار کے پہلے پھول احتیاط کے ساتھ کھلتے ہیں۔ لیکن جلد مجھے ایسے لگنے لگا کہ میرا اثر اس پر اچھا نہیں ہو رہا۔ مجھے اس کے گرد گہرے بادل نظر آنا شروع ہو گئے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے سورج طلوع ہونے سے پہلے غروب ہونے لگا تھا۔ اب میں دور رہتی تو اسے تکلیف ہوتی اور پاس رہتی تو اسے دیکھ کر میرا جی کڑھتا۔ میں مشکل میں پھنس چکی تھی اور اس اندھیرے میں مجھے کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر یکایک میرے ذہن میں ایک برفیلا طوفان ٹوٹ پڑا۔ یہ موسم میری زمین کے ٹکڑے پر نہیں پایا جاتا اور اچانک اس میں پھنس کر مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میں کسی اونچی چٹان سے گرنے والی ہوں۔ اس ٹھنڈ سے دونوں کو جمانے کے بجائے میں نے سوچا کہ اس سے دور بھاگ جاؤں۔ کوئی اب کسی کے پیچھے بھاگتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ زندگی اتنی تیز ہے کہ اب کوئی نہیں بھاگتا۔

مجھے اپنا ذہن اس کتب خانے جیسا معلوم ہوا جس کی کتابیں لفظوں کی بجائے لکیروں سے بھری ہوں۔ خالی چہرے اور خالی لفظوں سے کیا نصیحت ملتی؟

اکیلا پن زہریلا ہوتا ہے۔ وقت پھسل جاتا ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خیالات دماغ سے باہر نکل کر اصلیت بن جاتے ہیں اور گھیر لیتے ہیں۔ حال کو بھرنے کے لئے یادیں فلم کی طرح چلتی رہتی ہیں اور آہستہ آہستہ اپنی شناخت ہی مٹتی جاتی ہے۔ میں اس سے دور تھی لیکن صرف ذہنی طور پر۔ میں نے اس کی آواز سننی چھوڑ دی تھی۔

وہ اتنا خوبصورت تھا کہ میں دیکھ کر سوچتی تھی کہ خدا نے کسی کو اتنا حسین کیوں بنایا۔ اس کی باتیں سن کر مجھے لگتا

تھا کہ وہ ایک ایسا شاعر ہے جسے اپنی زبان ہی نہیں آتی۔ آدھی بات اس کی دل کے اندر ہی رہ جاتی تھی اور اس کا چہرہ اوروں کے لیے بقیہ بات مکمل کر دیتا تھا لیکن ایک شکل خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اسے ہر روز دیکھ دیکھ کر اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ ہر لمحے اس کے ہونٹوں کے درمیاں ایک سگریٹ ہوتی اور اس کے قریب بیٹھ کر مجھے سانس لینا مشکل لگتا۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ میں نہ آئی کہ میں پھر بھی کیوں اس سے زیادہ دور نہ بیٹھتی۔ کچھ عرصے بعد اس نے مسلسل کھانسنا شروع کر دیا اور نتیجتاً اس کی آواز اس کی داڑھی کی طرح بھاری ہوگئی۔ وہ میرے سامنے بدل گیا لیکن اس کو پھر بھی اپنی زبان نہ آئی۔ چند ایک جملے وہ کہتا تھا وہ بھی میرے ذہن کی آندھیوں کی نذر ہو جاتے۔ اس کا ہاتھ اگر چہ سہارا تھا مگر اس کے ارد گرد پھیلے دھوئیں میں میرا دم گھٹتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ سانس چھوڑوں یا ہاتھ؟

ایک دن ہم سورج کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی سی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کہ مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں ہلکے سرخ رنگ کی ہیں۔ سورج کی کرنیں ایسے پڑ رہی تھی جیسے وہ اس کی پلکوں سے ٹکرا کر اس کی آنکھوں میں چراغ جلا رہی ہوں۔ ایک دھیمی سی آگ تھی ان کے اندر اور ان کی تپش سے میرا جما ہوا خون پھر سے رواں ہونے لگا تھا۔ اس نے سگریٹ کو جلایا اور اندر سانس ایسے بھرا کہ میرا بھی جی چاہا کہ ایک دو کش لگائے جائیں۔ آنکھیں بند کیں اور دھواں باہر نکال دیا۔ وہ اس کے چہرے سے اوپر اٹھا اور ہوا میں ایسے پھیلا کہ مجھے اس دھوئیں میں ایک اور جہاں نظر آیا جو چند لمحات اسی دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔ کیا اس کے ذہن میں بھی خیالات ایسے ہی دم توڑ جاتے تھے؟ اسے دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جس ہاتھ سے وہ سگریٹ پکڑتا تھا اسی سے میرا ہاتھ بھی تھاما کرتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی دن وہ بھی ایسے ہی دھوئیں کی طرح ختم ہو جائے گا۔ جب میں نے اس بات کا تذکرہ کیا تو بولا:

''ہمیشہ ترستا تو یہ ہر روز نہ جلاتا۔''

اگر وہ ہمیشہ کا وعدہ بھی کرتا تو وہ جھوٹ ہوتا۔ امید انسان کو آہستہ آہستہ کھاتی ہے لیکن ہم اس کے بھروسے پر ہی چلتے رہتے ہیں۔ جھاڑیوں کے بیچ صرف امید کی آس پر۔

اس نے ایک دفعہ سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کی تو سورج کے سامنے بادل پھر سے آ گئے۔ میرے اور اس کے ذہن میں پھر کیا فرق رہا؟ میرے اندر اب امید کے سارے پتے زرد ہو کر گر پڑے اور ان پتوں پر صرف اس کے

قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔

جو اپنا خیال نہیں رکھ سکتی وہ کسی اور کا کیا خیال رکھے گی؟ ہر کسی کا اپنا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ میں اپنا آپ نہیں چھوڑ سکی لیکن اس کے سہارے میں بہتر ہوگئی اور میرا ہونا نہ ہونا اس کے لیے ایک برابر تھا۔ میں اس کے لیے سہارا نہ بن سکی۔ میں نے کوشش کی، میں نے ہاتھ پکڑا، لیکن اپنے طوفانوں میں ہاتھ آرام سے چھوٹ جاتے ہیں۔

اس کی آنکھوں کی آگ اب بجھے ہوئے کوئلوں کی طرح ہوگئی تھی۔ سر میں ہر وقت درد رہتا، اپنے موسموں کی شناخت اس کے اندر پا کر میرا وجود نئے طوفانوں کو جنم دیتا۔ اس کے پاس پھر بھی وجہ تھی ایسے ہونے کی، میرا عذر کیا تھا؟ حساس ہوں؟ پاگل ہوں؟ عاشق ہوں؟

ایسے دن گذر گئے۔ اس کی آواز ہر وقت تھکی تھکی سی رہنے لگی۔ اس کے ہاتھ خالی لگتے تھے۔ ایسی ہی کسی نامکمل کیفیت میں ایک دن میں کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ باہر اندھیرا ہوتا جا رہا تھا اور پرندے بھی اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ میرے اندر کی خاموشی آواز سننا چاہ رہی تھی۔ ذرا سی آہٹ سن کر میں نے پیچھے دیکھا تو وہ وہاں دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں اتنی تھکی ہوئی تھیں کہ میں نے جھنجھلا کر اپنی توجہ واپس چاند کی طرف کی اور اس کے نیچے ایک کتے کو کچرے کے ڈھیر سے مایوس ہو کر پلٹتے ہوئے دیکھا۔ دور سے ایک گھنا اور گہرا بادل پاس آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور ایسے تھا جیسے مجھے سانس آتے ہوئے بھی نہ آ رہا ہو۔ میں نے پیچھے مڑ کر اسے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سو چکا تھا اور اس کی سگریٹ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ چاند نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔ ہم نے کوئی بات نہ کی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کیا ٹوٹا۔ طوفان سے کون کہتا کہ تباہی نہ کر؟ ہلکی سی بارش شروع ہوگئی اور جلد ہی آسمان صاف ہوگیا۔ کھڑکی پر سر کو سہارا دے کر میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کیا ہونا تھا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ سو گیا اور میں نے ساری رات تارے گنتے گذار دی۔

(عائشہ شبیر لمز کی طالبہ ہیں)

انٹرویو: شمس الرحمٰن فاروقی

(شمس الرحمٰن فاروقی کا تعلق الہٰ آباد، انڈیا سے ہے۔ انھیں اُردو ادب کے ممتاز ترین نقاد اور فکشن نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ نومبر ۲۰۱۵ میں فاروقی صاحب پاکستان آئے اور لمز نے اُن کی میزبانی کی۔ اس دوران میں لمز کے ادبی حلقے 'حلقۂ دانش' کے طلبہ (عاکف اور دانش) نے اُن سے انٹرویو کی صورت میں ایک غیر رسمی گفتگو کی۔ ذیل میں اس گفتگو کو تحریری شکل میں پیش کیا جا رہا ہے)

عاکف: اپنی زندگی کے ابتدائی حالات اور تعلیمی سفر کے متعلق کچھ بتائیے؟

فاروقی صاحب: اوں ہوں! یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو بھائی! اچھا خیر، میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ والدین خوشحال تھے لیکن دولت مند نہیں تھے۔ شروع کی زندگی تو کچھ آرام سے گذری بلکہ یہ سال بڑے لاڈ میں گذرے۔ میرے نانا بڑے آدمی تھے اور جہاں میرے والد کی پوسٹنگ تھی اُسی شہر میں اُن کا گھر تھا تو تین چار سال بڑے سکون سے گذرے۔ اللہ بخشے ہمارے والدین بہت خوبیوں والے تھے لیکن اولاد پیدا کرنے میں بھی بڑے سخی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھائی جائے خواہ وہ مسلمان کسی قابل ہوں یا نہ ہوں تو اس طرح وہ بہت سے مسلمان پیدا کر رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک بچہ پیدا ہوا جو تین چار دن کا ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد دو بیٹیاں پیدا ہوئیں اور اُن کے بعد پھر یہ بندہ پیدا ہوا۔ ہماری امّاں دو دو بیٹیاں پال رہی ہیں جن کی عمریں مجھ سے ڈیڑھ سے ڈھائی سال بڑی تھیں۔ اس وجہ سے میں بہت بیمار رہنے لگا تو میری بڑی خاطر تواضع ہوتی خصوصاً نانا مرحوم مجھے بہت چاہتے تھے۔ وہ مجھے بچے میاں کہتے تھے اور یہ نام میں نے اپنے ناول (کئی چاند تھے سرِ آسماں) میں بھی استعمال کیا ہے۔ افسوس اب ہمیں بچے میاں کہنے والا کوئی نہیں رہ گیا سب کے سب چلے گئے اور یہ سزا ہوتی ہے جرمِ ضعیفی

کی۔تین چار سال بڑے دُلار سے پیار سے گذرے۔ہم چونکہ بہت سے بہن بھائی تھے تو ہماری خالاؤں اور ماموؤں نے ایک ایک بچے کی ذمہ داری لے لی تھی۔تو میری اماں کی ایک بڑی بہن نے شروع میں مجھے پالا۔

پھر میرے والد کی پوسٹنگ اعظم گڑھ ہوگئی اور ہم سب وہاں آ گئے۔پڑھنا ابتدا ہی سے شروع کر دیا تھا اور لکھنے کا شوق بھی شروع سے ہی تھا۔اُسی زمانے (۱۹۳۹ء) میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔اب دوسری جنگِ عظیم کی اپنی تنگیاں اور تنگدستیاں تھیں۔ہمارے والد دیہاتی سکولوں کے انسپکٹر تھے۔اُس زمانے میں وہ بڑی باعزت تنخواہ دار نوکری تھی۔دورے پر جاتے تھے تو بڑا سامان ہوتا تھا اُن کے پاس: اونٹ اور ایک تانگہ تھا، اس کے علاوہ کوچوان، نوکر چاکر بہت کچھ تھا لیکن دھیرے دھیرے سب ختم ہوتا گیا۔بچے پیدا ہوتے چلے گئے اور تنگیاں بڑھتی گئیں۔شروع کی زندگی میری کچھ ناخوشگوار سی رہی لیکن یہ نہیں کہ اُس ناخوشی کو میں شاعری کی طرف لے گیا۔دل میں صرف یہ تھا کہ کچھ لکھنا آئے یعنی ذہن میں تھا کہ ادیب افسانہ نگار وغیرہ بننا ہے۔سات آٹھ سال کی عمر میں ایک پرچہ نکالنا شروع کر دیا۔یہ سمجھ لیں کہ ایک گھریلو پرچہ تھا۔پرانی کاپی کے کاغذ واغذ پھاڑے پھر اُن کو باندھا اُس کا نام 'گلستان' رکھا۔اُس میں ہم اپنے مضامین لکھ کر چھاپتے رہے۔مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہٹلر کی تصویر اخبار سے کاٹ کر اُس پر چپکائی اور نیچے لکھا ''دنیا کی خوفناک ترین ہستی: ہٹلر''۔میں پڑھتا بہت تھا لیکن دل کا حال بہت کم لکھتا تھا۔

عاکف: تو گھریلو ماحول میں کتابیں آپ کو دستیاب تھیں؟

فاروقی صاحب: گھر میں کچھ کتابیں تو تھیں۔ہمارے والد اُس دور کے شمالی ہند کے ہندو مسلم کلچر کے مطابق پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھے۔مذہب کی طرف بے انتہا رُجحان تھا اُن کا، مذہبی کتابیں زیادہ پڑھتے۔وہ بہت کثیر المطالعہ تھے، اقبال کے بہت بڑے عاشق تھے، مجھے انھوں نے اقبال کی کچھ نظمیں پڑھائیں بھی۔اس کے علاوہ انھوں نے مجھے اُردو انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی مشق بھی کرائی۔وہ مجھے یہی کہتے تھے کہ تمھیں آتا واتا کچھ نہیں، نہایت نالائق ہو، موچی بنو گے یا رکشہ وغیرہ چلاؤ گے۔اور میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ میں ہوں ہی اسی قابل لیکن پھر میں نے لکھنا ہی شروع کر دیا۔ایک آدھ نظم بھی لکھی۔اور میں نے کہیں لکھا بھی ہے کہ پہلا مصرع جو زندگی میں میں نے ارشاد فرمایا وہ تھا ''معلوم کیا کسی کو میرا حال زار ہے۔'' تو یوں حال زار دل کا بیان کر دیا۔

کتابیں کچھ گھر میں تھیں اور کبھی کبھی والد گھر میں ناول بھی لایا کرتے تھے اُس زمانے کا ایک مشہور ناول تھا شمیم اور انور چپکے چپکے وہ بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کے نیچے دفتری/جلد ساز کی دُکان تھی۔ اُس کا بیٹا میرا ہم عمر تھا وہاں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ بجائے کھیلنے کے وہیں بیٹھے رہتے اور کتاب وغیرہ پڑھنے لگے۔ جو ہاتھ لگتا پڑھنے لگے سمجھ میں آیا یا نہیں لیکن پڑھا بہت کچھ۔ بہت عرصے تک تو یونہی چلتا رہا۔ تین چار سال تک 'گلستان' بھی نکلتا رہا۔ جب ہائی سکول تک پہنچے تو نویں جماعت میں والد کا تبادلہ ہو گیا۔ نویں جماعت پاس کر کے ہم والد کے ساتھ اعظم گڑھ سے گورکھ پور آ گئے۔ وہاں بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ وہاں ذرا ماحول بڑا تھا، مجنوں صاحب تھے گورکھ پور میں، کالج میں پڑھاتے تھے، بڑا دبدبہ تھا اُن کا، انگریزی کے پروفیسر اور اُردو کے بڑے نقاد تھے۔ میں اُن کے کالج میں تو نہیں پڑھا تھا لیکن وہاں اکثر چلا جایا کرتا تھا۔ میں نے اُن کی کتابیں بہت سی پڑھیں۔ تو اس طرح سے پڑھنا ہی پڑھنا رہا۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت لکھنا بھی، کچھ افسانے وغیرہ لکھے ان میں سے کچھ چھپے بھی لیکن زیادہ تر نہیں چھپے۔

کالج کے زمانے میں کچھ جماعت اسلامی کے زیرِ اثر بھی آ گیا۔ مسلمان طالب علموں کے سامنے دو ہی راستے ہوتے تھے یا تو جماعتِ اسلامی میں جائیں یا پھر کمیونسٹ پارٹی میں۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اُن دنوں بہت زور تھا۔ ہم نے شروع ہی سے یا پھر مذہب کی بنا پر، یا پھر میں نے اُس دور تک زیادہ کتابیں ہی ایسی پڑھیں کہ جن میں اسلام کے بارے میں کمیونسٹ لوگوں کا رویہ اچھا نہیں لگا۔ ہمارے والد صاحب کے ایک دوست تھے بڑے مذہبی آدمی تھے۔ اُن کے متعلق سنا تھا کہ پہلے وہ کمیونسٹ تھے لیکن اب وہ بہت مذہبی ہو گئے تھے۔ میں نے ایک دن ہمت کر کے پوچھا کہ آپ کے کمیونزم سے منحرف ہونے کی وجہ کیا تھی۔ انھوں نے کہا ''کمیونسٹ بداخلاق بہت تھے اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ بداخلاقی دنیا میں چل نہیں سکتی۔'' اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ یہ پوچھ سکوں کہ بداخلاقی سے یہ کیا مراد لیتے ہیں اس سے بے دین مراد لیتے ہیں، یا عیاش و خراب وغیرہ۔ لیکن ایک بات سمجھ میں آئی کہ اخلاق کی بنیاد پر بھی انسانوں کی سیاسی اور ذہنی اقدار متعین ہو سکتی ہیں۔

میں جماعتِ اسلامی کے جلسوں میں کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ افسانے وغیرہ پڑھ دیا کرتا تھا وہاں۔ ایک مرتبہ افسانہ پڑھا تو وہاں سے نکالا گیا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ یہاں سنانے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی یہاں تو

مارے گئے، 'ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی'۔

عاکف: آپ کے مضامین بھی ادب سے متعلق تھے؟

فاروقی صاحب: نہیں بھائی! ہم تو افسانے وغیرہ ہی لکھتے تھے۔ مضامین کون لکھتا تھا اور کچھ شاعری وغیرہ کر لیا کرتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ نظم کہہ دی۔ موزونیت وغیرہ کا پتہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ والد سے ڈانٹ بھی پڑی کہ یہ سب موزوں نہیں۔ کیا بکواس لکھتے ہو۔ میں نے غصے میں آ کر سب اُٹھا کر پھینک دیا۔ اس پر والد صاحب نے سزا دی، بڑا مارا۔ کہنے لگے بدتمیزی کرتا ہے نانہجار۔ ایک آدھ دفعہ مضمون بھی لکھا، کچھ فلسفیانہ طرز کا کیونکہ مجھے فلسفے اور نفسیات کا بھی ذوق تھا اس دور میں۔ ایک صاحب کا کمیونزم کے خلاف ایک مضمون تھا مگر اُس کے آدھے حصے میں ہٹلر کی تعریف تھی، وہ حصہ میں نے چھوڑ دیا اور بقیہ ترجمہ کر ڈالا۔

عاکف: آپ نے زمانۂ طالب علمی میں سائنس نہیں پڑھی؟

فاروقی صاحب: ہم کیا جانیں سائنس کیا ہوتی ہے؟ میں سائنس میں ہمیشہ فیل ہوتا رہا۔ وہ تو اللہ کی مہربانی سے ہمارے زمانے میں ہائی سکول میں ریاضی (Mathematics) کا مضمون لازمی نہیں تھا ورنہ ہم کبھی پاس ہی نہ ہوتے۔

دانش: بڑے خوش نصیب تھے آپ!

عاکف: آپ کی اس ساری گفتگو سے لگتا ہے کہ ادب کا ذوق آپ میں فطری طور پر تھا؟

فاروقی صاحب: جی ہاں!

عاکف: آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ذوق صرف فطری ہی ہوتا ہے یا کہ انسان اس کو سیکھ بھی سکتا ہے اپنے ماحول سے؟

فاروقی صاحب: کوئی بھی فطری چیز اپنی اصلی صورتِ حال پر قائم نہیں رہتی۔ وہ دھیرے دھیرے گھٹنے لگتی ہے۔ اس کو اپنی حالت پر قائم رکھنے کے لیے اور اگر اس کو ترقی دینی ہے تو اس کو ترقی دینے کے لیے مشق اور مداومت کے ساتھ ساتھ اس کے لیے جو ضروری سامان ہوتا ہے وہ ہونا چاہیے۔ ہمارے اکثر شاعروں کو شعر کہنے کا ملکہ ہے یعنی

موزوں کر لیتے ہیں اب وہ اسی میں خوش ہیں اور کبھی اس کے آگے نہیں دیکھتے کہ شعر کہنے کے لیے اور کیا طریقے ہیں ،اور لوگوں نے شعر کیسے کہا ہے، شعر کی شرائط کیا ہیں، لوازم کیا ہیں۔

مجھے لکھنے پڑھنے کا ذوق تو شروع سے تھا لیکن اُس وقت میرے دل میں یہ تو نہیں تھا کہ مجھے کوئی بڑا ادیب بننا ہے، شہرت کمانی ہے، مجھے اس کا کوئی آئیڈیا ہی نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ لکھنا آئے کیوں کہ لکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اُس کے لیے ظاہری بات ہے مطالعہ چاہیے تھا۔ انگریزی مطالعہ کا ذوق پہلے بھی تھا لیکن والد صاحب کی سرزنش نے اسے اور جلا بخشی۔ غالباً میں دسویں یا گیارہویں میں ہوں گا جب میں نے انگریزی کا پہلا ناول جو سر سے لے کر پاؤں تک میں نے پڑھا وہ *Pride and Prejudice* تھا۔

عاکف: میں نے بھی وہی پڑھا تھا۔

فاروقی صاحب (ہنستے ہوئے): لو بھیا! انجام بُرا ہوگا تمھارا۔

کوئی بھی ذوق اور فطری صلاحیت، بغیر محنت کے پروان نہیں چڑھتی۔ موسیقی والوں کو لیجیے۔ تین برس سے ہی بچے کو ریاض کرنے کے لیے بٹھا دیتے ہیں۔ چاہے وہ مرے چاہے جیے لیکن آٹھ گھنٹے ریاض اُس سے کراتے ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اُس کا دورانیہ دس سے بارہ بلکہ چودہ گھنٹے تک ہو جاتا ہے۔ اب اگر اُس میں ذرا سا بھی ٹیلنٹ/صلاحیت ہو تو اتنے ریاض اور اُستاد کی اتنی توجہ سے وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ میرا معاملہ بھی یہی ہے کہ میں پڑھتا رہا، لوگوں سے بھی کچھ پوچھتا رہا اس کی بنا پر جو تھوڑا بہت ٹیلنٹ/صلاحیت مجھ میں تھی اس کو جلا ملتی گئی۔

دانش: اُردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے آپ کی رائے جاننا چاہیں گے اس تناظر میں کہ ابھی جو ماڈرن/جدید رجحان آ گیا ہے کہ جس کے تحت رومن میں اُردو لکھنے کا رواج پڑ گیا ہے۔

فاروقی صاحب: افسوس کا مقام ہے۔ کون کہتا ہے یہ؟

عاکف: ایک تو موبائل فون پر ایس ایم ایس، اس میں شروع ہو گیا ہے۔ دوسرا ریختہ والوں نے بھی، حال آنکہ اچھا کام کیا ہے، رومن اُردو کا استعمال کیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس کا مستقبل پر کیا اثر ہوگا اور کیا اس کے بھی اصول وضوابط طے کرنے ہوں گے؟

فاروقی صاحب: ارے بھائی! 'ریختہ' نے تو آپ کی خدمت کی ہے۔ جو اُردو نہیں جانتے ہیں، جن میں ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہے، اور جن کو بے انتہا شوق ہے غالب اور دیگر بڑے شعرا کے شعر پڑھنے کا، اور منٹو اور انتظار حسین جیسے افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھنے کا، اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ریختہ والوں نے اُردو متن کو انگریزی، ناگری اور رومن میں لکھ کر اس کے معنی بھی بیان کر دیے ہیں۔ وہ یہ تھوڑا ہی کہہ رہے ہیں کہ اُردو کا رسم الخط یہی ہے۔ اصل متن تو اُردو میں ہی لکھا ہے۔ اور پھر وہ میرے آپ کے لیے تھوڑا ہے، یہ اُن لوگوں کے لیے ہے جن کو اُردو نہیں آتی ہے۔ اُن کی توقع ایک تو یہ ہے، جو یقیناً پوری بھی ہو رہی ہے، کہ جن کو اُردو پڑھنے کا ذوق ہے لیکن اُن کو اُردو نہیں آتی اس سے وہ آسانی سے پڑھ لیں گے۔ اور اگر کچھ لوگ اُردو کم جانتے ہیں تو اس سے ان کی مشق بڑھ جائے گی۔ دوسرے سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں باقاعدہ اُردو پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا۔ اس وقت ہندوستان میں تین چار لاکھ آدمی ایسے ہیں جو correspondence کورسز سے اُردو پڑھ رہے ہیں۔ اُن میں سے اکا دُکا مسلمان ہوں گے باقی سب غیر مسلم ہیں۔ اب المیہ مسلمانوں میں بھی یہ ہے کہ انھوں نے بھی بعض جگہ بڑی حد تک اُردو کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو اُردو ادب و شاعری کے ذوق میں اس قدر گرفتار ہے کہ وہ اُردو سیکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اُن لوگوں کو 'ریختہ' کے ذریعے یہاں ایک امداد مل گئی۔

جو بچے بچارے مغرب میں رہتے ہیں اور اُن کے ماں باپ نے انھیں اُردو نہیں سکھائی، یا سکھانا چاہی بھی تو انھوں نے نہیں سیکھی۔ اب اس وجہ سے جو ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ پر رومن اُردو کا چکر چل رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئی بڑا اچھا کام ہو رہا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کی نالائقی، نااہلی اور نارسائی کی دلیل ہے۔ اس سے آپ یہ ثبوت نہ لیجیے کہ اُردو رسم الخط جا رہا ہے۔ اور میں ہمیشہ سے، زندگی کے پہلے لمحے سے آخری لمحے تک اُردو رسم الخط کی مدافعت کروں گا۔ اور میں ایک زبان کا تصور رسم الخط کے بغیر نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اصولی طور پر لسانی اعتبار سے ماہرینِ لسانیات رسم الخط کو زبان کا لباس تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اب میں نے پینٹ کوٹ تو پہنا ہوا ہے، لیکن اس کے نیچے بنیان اور جانگیہ بھی ہے لیکن اگر کوئی میرا پینٹ کوٹ اُتروا دے تو جانگیہ بنیان رہ جائے گا یعنی لباس تو پھر بھی رہے گا۔ یہی

حال اُردو کو رومن اور ناگری میں لکھنے کا ہے، یعنی اُس کا اصل لباس اُتر جائے گا اور جانگیہ وغیرہ باقی رہ جائے گا۔ صرف یہی نہیں ہے کہ ظ اور ض کا فرق بتایا جائے بلکہ جیسی بولی جاتی ہے اُردو یعنی جو زبان کا آہنگ ہے بغیر پڑھے ہوئے وہ نظر نہیں آتا۔ یہ بات کان کھول کر سُن لو اور سمجھ لو ہزار تم اُردو کو انگریزی میں پڑھ لو جب تک تم اُسے اُردو رسم الخط میں لکھا ہوا نہیں دیکھو گے تب تک تم اُس کا نہ ذائقہ سمجھو گے، نہ لہجہ سمجھو گے اور نہ یہ سمجھو گے کہ ذہن میں اس کی کیا تصویر بن رہی ہے۔ جیسے اقبال کا یہ شعر ہے،

اگرچہ یہ اُردو کا typical شعر نہیں ہے لیکن اقبال تو، کم از کم اس دور کے، اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسدللہی وہی مرحبی وہی عنتری

اب اس کو آپ رومن میں لکھ کر دیکھیے نہ اس میں حریف نظر آئے گا اور نہ ستیزہ گاہِ جہاں نظر آئے گی۔ خیر فطرتِ اسدللہی، مرحبی اور عنتری کو تو چھوڑ ہی دیجیے۔ اب مرحب کے م اور عنتری کے ع میں جو مزا ہے وہ آپ انگریزی میں کہاں سے لائیں گے۔ اُس پر ڈاٹ لگائیں، دُم لگائیں جو بھی لگائیں لیکن اُس حرف میں خود جو قوت ہے وہ آپ کیسے سمجھیں گے، آپ کو معلوم ہی نہ ہو پائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم رومن، ناگری یا انگریزی میں اُردو زبان لکھ کر زبان اور اس کے معانی تو ادا کرلیں گے لیکن یہ ایسے ہی ہوگی جیسے کسی کا لباس اُتار کر اُسے جانگیے اور بنیان میں بٹھا دیا جائے۔

عاکف: داستان، ناول اور افسانہ، یہ اہم اصنافِ ادب ہیں۔ آپ فنی حوالے سے ان میں کیا فرق کرتے ہیں؟

فاروقی صاحب: بیٹا! داستان زبانی سنائی جاتی ہے۔ اگر داستان تمھیں لکھی ہوئی نصیب ہوئی ہے تو یہ تمھاری خوش نصیبی ہے۔ اللہ نول کشور کو ضرور جنت نصیب کرے گا جس نے یہ چھاپ دی۔ اگر جنت نہ ملی تو ہم اللہ سے کہہ دیں گے انھیں جنت میں ڈال دیں گے اور ان کے بدلے ہمیں دوزخ میں۔ اگر وہ نہ چھاپتے تو ہم تک پہنچتی کہاں

سے؟ داستان چاہے لکھی گئی ہو لیکن اس کا مقصد سنایا جانا ہے۔ میں نے ایک جگہ اپنی کتاب میں حوالہ دیا ہے کہ محسن جاہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''تحریر میں لطفِ تقریر ہو''۔ہم لوگوں کو اکثر بتایا جاتا ہے کہ تحریر بڑی شاندار چیز ہوتی ہے جب کہ تقریر پلپلی چیز ہوتی ہے لیکن میں یہاں آپ کو اُلٹا بتا رہا ہوں کہ تحریر میں لطفِ تقریر ہو کیونکہ تقریر میں جو مزا ہے وہ اور طرح کا ہے جو تحریر والے کو معلوم نہیں۔ تو داستان اور جو دوسری بیانیہ اصناف ہیں اُن کا بنیادی، اصلی اور ہمیشہ قائم رہنے والا فرق یہ ہے کہ داستان زبانی سنائی جاتی ہے اور یہ لکھی ہوئی بھی ہو تو زبانی سنائے جانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ ہم اُردو والوں کی نالائقی، محرومی، بیوقوفی بلکہ بدنیتی ہے کہ انھوں نے باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کو داستان بنا دیا۔ یہ داستان تو ہیں ہی نہیں۔ فسانۂ عجائب تو ایک کہانی ہے جو باغ و بہار کی مقبولیت سے متاثر ہو کر لکھی گئی اور اُس میں انھوں اپنا ہنر استعمال کیا اور اچھا استعمال کیا۔ باغ و بہار انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لیے لکھی گئی اب تم سمجھ سکتے ہو کہ قوم اتنی دیوالیہ ہو چکی ہے کہ جو غیر ملک کے نالائقوں کو اُردو پڑھانے کے لیے کتاب لکھی گئی اس کو تم اپنی نثر کا شاہکار مانتے ہو۔ میرا تو زندگی بھر کا یہ شکوہ رہے گا اُردو والوں سے کہ وہ چیزیں جو ہمارے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور نہ رکھنی چاہیے اُن چیزوں کو ہم لوگوں نے شاہکار بنا بنا کر اپنے گھروں میں رکھا اور غلط بیانی کی کہ یہ داستان ہے۔

اب ناول پہ آتے ہیں۔ داستان اگر زبانی سنانے کی چیز ہے تو ثابت یہ ہوا کہ ناول سنانے کی چیز نہیں۔ یہ بات میں نے باختین کے حوالے سے نقل کی ہے کہ دنیا میں ناول نگار سے بڑھ کر کوئی تنہا نہیں ہے کیونکہ اُس کو پتہ نہیں ہے کہ ناول کون پڑھے گا؟ کہاں پڑھا جائے گا؟ کب پڑھا جائے گا؟ اُس نے تو بس کاغذ پر لکھ دیا۔ یہ بہت بڑا فرق ہے۔ چنانچہ داستان، داستان گو اور داستان کے سامع کے درمیان ایک فطری ربط ہوتا ہے اور اگر فطری ربط نہیں بھی ہوتا تو وہ ربط بنا لیا جاتا ہے۔ ہم داستان سننے جائیں گے ہی نہیں جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ اس میں سنایا کیا جائے گا۔ اس میں ہمارے اور اُس کے اقدار مشترک ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ہوتے تو داستان گو آپ کے اقدار کو اُس میں داخل کر لیتا ہے کیونکہ اُس نے تو آپ سے اپنی روٹی کمانی ہے۔ اگر اُس کے سامعین شیعہ ہیں اُس میں وہ شیعہ عناصر شامل کر لیتا ہے اگر سُنّی ہیں تو اس میں سُنّی عناصر ڈال دے گا، اگر آپ کی کسی سے دشمنی ہے تو اُسے گندے لوگوں میں

دکھادے گا کسی سے آپ کو محبت ہے تو انھیں اچھے لوگوں میں دِکھادے گا۔ اس طرح کی باتیں بھی داستان میں ہوتی ہیں اور یہی اس کا کمال ہے کہ یہ اتنی سیال (fluid) چیز ہے کہ داستان رہتے ہوئے بھی اُس میں اور تمام چیزیں بھی داخل ہوجاتی ہیں۔

اب ناول کیسے پیدا ہوا اس کے بارے میں انگریزوں نے جو چار پانچ نظریات (theories) قائم کیے ہیں وہ آپ کو معلوم ہی ہوں گے میں یہاں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ درحقیقت جب مسلمانوں کے ہاں عربی میں ناول قسم کی چیز لکھی گئی اُس دور میں وہاں (مغرب میں) ناول نہیں تھا۔ مسلمانوں کا پہلا ناول عربی میں حیّی بن یقظان ہے جو ابنِ طفیل نے گیارھویں صدی میں سپین میں لکھا۔ اس کا مرکزی کردار تقریباً انگریزی کا رابنسن کروزو (Robinson Crusoe) معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک بچہ ہے جو جنگل میں اکیلا زندگی گزارتے ہوئے جوان ہوتا ہے۔ پھر وہ خود سے شعور حاصل کرتا ہے: زندگی کے مظاہر کو دیکھتا ہے، موت وحیات کو دیکھتا ہے، خوراک کے بارے میں فکر کرتا ہے، لباس کے بارے میں سوچتا ہے۔ اُس کا نام ہی انھوں نے حیّی بن یقظان رکھا جس کا معنیٰ ہی یہ ہے کہ 'جاگتا ہوا سوتے کا بیٹا'۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ یہ گیارھویں صدی میں اسپین میں لکھا گیا۔ اس کے آس پاس یا اُن کے کچھ پہلے یا بعد ایک جاپانی خاتون مُوراساکی شیکی بُو (Murasaki Shikibu) جاپان میں بیٹھی ہوئی ایک ناول لکھ رہی تھیں گینجی کی داستان (*The Tale of Genji*)۔ اب یہ ایک لمبا چوڑا ناول ہے۔ اب ذرا زیادہ کھینچ کر لے جایئے تو یونان میں بھی ایک آدھ لوگوں نے ناول نما کوئی چیز لکھی۔ لیکن ناول کی جو مقبولیت پیدا ہوئی وہ اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی ہے اس میں یقیناً پرنٹنگ پریس اور خواندگی کی شرح کے بڑھنے کا بہت ہاتھ ہے۔ خواندگی جو پہلے دس پندرہ فیصد تھی وہ بڑھ کر پچاس ساٹھ اور ستر فیصد ہوئی اور پھر کئی ملکوں میں تو سو فیصد تک ہوگئی۔ یہ چیز تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہے کہ آج سے ستر پچھتر برس پہلے کی بات ہے کہ ایک بجلی بنانے والے کارخانے میں پندرہ بیس بجلی بنانے والے ہیں اور اُن میں سے ایک کو بجلی بنانے سے چُھٹی دے دی گئی ہے اور وہ باقی لوگوں کو ناول پڑھ کر سُنا رہا ہے یعنی پندرہ بیس لوگوں میں ایک آدمی خواندہ ہے جو باقی لوگوں کو ناول پڑھ کر سُنا رہا ہے تو خواندگی نے ناول پڑھنے کا کلچر پیدا کیا۔ ناول کی مقبولیت تو ضرور اس بنا پر ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

ناول کوئی انڈسٹریل کلچر کی چیز ہے یا یہ جدید زمانے کے کسی اور تقاضے کو پورا کر رہا ہے۔ یہ تقاضا تو بہت پہلے سے پورا کیا جارہا ہے کہ لوگ مختلف قسم کی چیزیں لکھ رہے تھے۔ اب جیسے یہ کہا جارہا ہے کہ انٹرنیٹ اور دوسری چیزیں آنے سے اب کون ان چیزوں کو پڑھے گا۔ اب اس کا جواب اس بات میں مل جاتا ہے کہ پڑھنے اور پڑھ کے سنانے کی ایک انسانی ضرورت ہے جو ہمیشہ پوری ہوتی رہے گی۔ لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انسان صورتیں مہیا کرے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ناول، جیسا کہ مختلف لوگوں نے لکھا کہ ناول صنعتی عہد (industrial age) کی پیداوار ہے، کمیونسٹوں نے کہا کہ جب طبقاتی کشمکش بڑھنے لگی تو اس کشمکش کو ظاہر کرنے کے لیے ناول لکھا گیا، تو یہ غلط ہے۔ کسی صنفِ ادب کے وجود میں آنے کی وجہ بیان کرنے کے لیے اگر آپ جتنی بھی تھیوریز (theories) بنائیں گے تو منہ کے بل گریں گے، کیونکہ آنے والے کل میں وہ اُلٹا ہو جائے گا۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے یا تاریخ میں ہے اُس کی بات کر لیں لیکن یہ ہے کہ آپ کوئی تھیوری بنائیں گے تو کسی نہ کسی وقت غلط ثابت ہو جائے گی۔ میں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ خواندگی کے بڑھنے سے جو پڑھنے کا شوق لوگوں میں تھا ناول سے اُس شوق کو ایک مہمیز مل گئی۔

عاکف: آپ کے تخلیقی کام میں آپ کی تنقید نگاری کس حد تک معاون ثابت ہوئی یا تنقید نگاری نے آپ کے تخلیقی عمل کو کتنا فائدہ پہنچایا؟

فاروقی صاحب: تنقید نگاری ایک تیسرے درجے کی چیز ہے، وہ مجھے تخلیق میں کیا فائدہ دے گی۔ تنقید میں نے اس لیے اختیار کی کیونکہ اُس دور میں لوگ جو تنقید لکھ رہے تھے میں اُس سے نا مطمئن تھا، وہ مجھے اپنے کام کی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ جو باتیں بتاتے تھے کہ ادب کی بنیاد کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ کس چیز کو ادب کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں؟ ایک تو اُس دور میں لبرل لوگوں کا زور تھا وہ صنعتی انقلاب، طبقاتی و سماجی کشمکش، مزدوروں کے حقوق اور مقصدیت کی بات کرتے تھے لیکن یہ نہیں بتاتے تھے کہ مقصدیت کے آگے کیا ہونا چاہیے اور اگر وہ کچھ بتاتے بھی تھے تو وہ کسی کی سمجھنے میں نہیں آتا تھا۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ ہمارے وقتوں میں اس طرزِ تنقید کے بڑے مبلغ اور مفکر تھے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ ادبیت اور مقصدیت کو ساتھ ساتھ رکھو لیکن یہ بتاتے نہیں تھے کہ ان کو کیسے ملایا جائے۔ وہ صرف حکم لگا دیتے تھے کہ ایسا کرو۔ مجھے ان سب چیزوں سے بہت اُلجھن تھی کہ اتنا سب کچھ پڑھایا جاتا

ہے لیکن یہ کوئی بتا تا نہیں کہ ان میں کیا ہے۔تو پھر میں نے تنقید لکھنی شروع کر دی کچھ اصولی اور بنیادی باتوں کے حوالے سے۔

تنقید دراصل ایک طرح سے ضروری چیز ہے لیکن آج کل زیادہ ضروری ہے کیونکہ اب معاشرے میں بہت افتراق ہے۔آج تخلیق کار اور اُس تخلیق کو استعمال کرنے والے کے درمیان ایک بہت وسیع خلیج ہے، یعنی دونوں میں مشترک چیزیں بہت کم ہیں۔داستان گو اور داستان کے سامع میں کچھ چیزیں مشترک تھیں وہی مشترک چیزیں شاعر اور اُس کے سننے والے کے درمیان تھیں۔میں نے کہیں یہ لکھا بھی ہے کہ لوگ اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ غالب کے زمانے میں یہ نقاد لوگ کہاں تھے۔میں کہتا ہوں کہ اُس وقت تو سارا معاشرہ نقاد تھا جو تخلیق کار کی ہر کمزوری کو جانتا تھا اور اُس کی گرفت بھی کرتا تھا اور وہ (تخلیق کار) اُس کا جواب دینا بھی جانتا تھا۔اب یا تو آپ اُس معاشرے کو اپنے راستے پر لگا لیں یا معاشرے کے راستے پر آپ چلیں یا پھر دونوں کے درمیان مفاہمت کر لیں۔اب وہ سب کچھ نہیں رہا اور اس کی جگہ افتراق آ گیا۔آج نقاد یہ سمجھتا ہے کہ وہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان ایک پُل کا کام کر رہا ہے، یا کیمیا گری (جسے انگریزی اُردو میں ایجنٹ کہتے ہیں)، کا کام کر رہا ہے۔نقاد اس لیے بھی پیدا ہوئے کہ اُردو سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جانے لگی۔ویسے سکولوں کالجوں میں اُردو پڑھانے کا نقصان ہوا، اس سے نقاد پیدا ہونے لگے اور ہر نقاد اپنی ہی گائے جا رہا ہے۔تو مجھے تنقید نگاری سے ذرا فائدہ نہیں ہوا۔ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری تخلیق سے تنقید کو ضرور فائدہ ہوا۔

دانش: جہاں تک ہم سمجھ پائے وہ یہ کہ وہ جو آپ کی علمیت تھی، جب آپ نے افسانوی نثر لکھی تو وہ ایک قوت کے طور پر تو آپ کے کام آئی مثلاً میر اور داستان وغیرہ پر آپ کا کام؟

فاروقی صاحب: ہاں! علم تو تخلیقی عمل میں میرے کام آیا یعنی داستان کا علم، میر کا علم، پرانی شاعری اور تہذیب کا جو مطالعہ کیا وہ میری تخلیق میں کام آیا ورنہ یہ ناول کہاں ہوتا؟ اُردو، ہندی اور انگریزی کے جتنے لوگوں نے میرا انٹرویو لیا اُن سب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اس ناول کے لیے آپ نے کتنا پڑھا؟

میں نے اُن سے کہا کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔اسّی برس کی زندگی میں کم از کم پانچ برس کی عمر سے چیزیں

مجھے یاد ہیں، کچھ اس سے پہلے کی بھی یاد ہیں۔ لیکن حافظے کا معاملہ یہ ہے کہ دھوکہ بہت دیتا ہے، بہت بدمعاش ہے یہ۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ حلف اُٹھالیں گے، قُرآن شریف سر پر رکھ لیں گے کہ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اُس کو بیچ میں ڈالتے ہوئے اور اس امکان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ بہت ساری چیزیں میں نے فرض کرلیں کہ ہوئیں لیکن نہیں ہوئی تھیں، مجھے مگر یاد بہت ہے، گھر کی رسمیں مجھے بہت سی یاد ہیں وغیرہ۔ مجھے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میرے باپ کا پورا خاندان دیوبندی تھا اور ہے جب کہ ننھیال سارا بریلوی تھا اور ہے۔ جو چیزیں دیوبندیوں کے ہاں منفی سمجھی جاتی تھیں وہ یہاں کی جاتی تھیں۔ تو جو کچھ میں نے وہاں نہیں دیکھا وہ یہاں دیکھ لیا اور جو یہاں نہیں دیکھا وہ وہاں دیکھ لیا۔ تہجد پڑھنے والوں اور ذکر بالجہر کرنے والوں کو یہاں دیکھ لیا۔ میرے بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ اپنے گاؤں گیا۔ وہاں ہمارے دادا کا ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ اس میں پلنگ وغیرہ تھے جہاں باہر کے مہمان وغیرہ ٹھہرا کرتے تھے، دادا کا شاید اُس وقت انتقال ہو چکا تھا مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ہم رات کو دیر سے پہنچے تو ہمارے ابّا نے ہمیں ایک بڑے سے پلنگ پر سُلا دیا۔ بہت چھوٹا تھا میں اور شاید وہ میرے ساتھ ہی سو گئے۔ رات گئے ہمارے ایک بڑے ابّا (تایا) آئے۔ رات میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے جنات میں سے کوئی بول رہا ہے، حال آنکہ وہ ذکر بالجہر کر رہے تھے۔ اُن کی آواز میں اتنا دبدبہ اور ایسا جلال تھا کہ خوف سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ تو خیر جو چیزیں میں نے ددھیال میں نہیں دیکھیں وہ ننھیال میں دیکھ لیں اور جو ننھیال میں نہیں دیکھیں وہ ددھیال میں دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ محرم کے مہینے میں لوگ گلوں میں رومال ڈالتے اور سینہ وغیرہ پیٹتے، بچوں کو ایک خاص طرح سے تیار کیا جاتا جو پھر علامتاً امام حسینؓ کے سپاہیوں تک پیغام وغیرہ لے کر جاتے۔ میں نے ان سب چیزوں کو بہت دیکھا اور ان کو اپنی جگہ درست سمجھا کہ اگر یہ میرے ہاں ہو رہا ہے تو درست ہی ہوگا۔ ہاں یہ بھی ہے کہ میرے نانا نے میرے ابّا اور دادا سے کبھی نہیں کہا کہ میں اپنی بیٹی تمھیں نہیں دوں گا کیونکہ تم وہابی ہو بدمعاش ہو۔ نہ میرے دادا نے کبھی یہ کہا کہ میں تمھیں اپنا بیٹا نہیں دوں گا کہ تم بریلوی ہو، غیر مسلم ہو، لیکن اب یہ سب ہونے لگا ہے۔ خیر میں نے سب کچھ دیکھا اور وہ سب مجھے یاد ہے: کپڑوں کے نام یاد ہیں، لوگ کپڑے کیسے پہنتے تھے، بولتے کیسے تھے، رسمیں کیسے ادا ہوتی تھیں، رونمائی کی رسم کسے کہتے ہیں وہ

آسمان کے نیچے کیسے ادا ہوتی ہے، آرسی مصحف کیا بلا ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ جن کا آج کل کے بچوں کو نہیں پتا۔

جو میں نے پڑھا اور دیکھا اُس نے میری تخلیق میں ضرور بہت کام کیا اور بغیر پڑھے تو یہ تخلیق (کئی چاند تھے سرِ آسمان) ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن ایسا بالکل بھی نہیں کہ میں نے لکھنے سے پہلے کتاب کھولی ہو۔ ہاں کہیں کہیں کوئی خاص بات جاننے کے لیے، جیسے نواب کو پھانسی کس تاریخ کو لگی، وغیرہ، تو کتاب دیکھی۔ درحقیقت اس ناول کی جو روح ہے وہ میری روح ہے جو اپنی حد تک میں نے وہاں کاغذ پر کشید کر دی ہے۔

محمد عاطف رشید ملک

کچھ کتابوں اور کتاب خانوں کے بارے میں

(پاؤلوکوئیلھو (Paulo Coelho) کے ایک اقتباس کا اُردو ترجمہ)

میرے پاس کچھ زیادہ کتابیں نہیں۔ چند سال قبل کم سے کم اشیا کے ساتھ بہتر سے بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے خیال سے متاثر ہو کر میں نے بعض ترجیحات مرتب کیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں نے رہبانیت اختیار کی بلکہ اس کے برعکس اپنی زیرِ ملکیت چیزوں اور اختیارات کو ختم کرنا دراصل اپنے آپ کو بے انتہا آزادی دینے کے مترادف ہے۔ میرے کچھ احباب، جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں، شکوہ کناں رہتے ہیں کہ ان کے پاس کپڑوں کا ذخیرہ موجود ہے مگر وہ اپنی زندگی کا بیشتر وقت یہ فیصلہ کرنے کی کوشش میں ضائع کر دیتے ہیں کہ کیا پہنا جائے۔ اب چونکہ میں نے لباس کے لیے اپنی الماری کو صرف بنیادی سیاہ رنگ کے ملبوسات تک محدود کر دیا ہے اس لیے اب مجھے اس مشکل سے تقریباً نجات مل چکی ہے۔

تاہم یہاں مجھے فیشن کے بارے میں نہیں بلکہ کتابوں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اپنے بنیادی نکتے کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے اپنے کتاب خانے میں صرف چار سو کتب رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے کچھ میرے لیے جذباتی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں اور کچھ کتابوں کو ہمیشہ میں بار بار پڑھتا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ مختلف وجوہات کی بنا پر کیا۔ ان میں سے ایک تو مجھ پر چھا جانے والی وہ اداسی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ کسی کی زندگی بھر کی محنت و مشقت سے جمع کیے گئے کتابوں کے ذخیرے کو اُن کی وفات کے بعد کس قدر بے توقیری کے ساتھ نیلام کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ بھی کہ کتابوں کو گھر کی زینت بنانے کا کیا فائدہ اور مقصد؟ کیا اپنے حلقۂ احباب کے سامنے یہ ثابت

کرنا کہ دیکھو میں کتنا مہذب و فطین ہوں؟ یا محض دیواروں کی تزئین و آرائش کرنا؟ جو کتابیں میں نے خریدیں وہ شاید میرے گھر کے بجائے عوامی کتب خانے میں کہیں زیادہ مفید ہوں گی۔

میں کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنی کتب اس لیے درکار تھیں کہ کبھی بھی ان میں سے کوئی چیز ڈھونڈنے کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ تاہم اب اگر مجھے کسی چیز کو ڈھونڈنا ہو تو میں اپنا کمپیوٹر آن کرتا ہوں، لفظ یا الفاظ کا اندراج کرتا ہوں اور مجھے جو بھی چیز درکار ہوتی ہے وہ سکرین پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ انٹرنیٹ کی بدولت ہے جو کہ قطعۂ ارض پر سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔

بے شک میری کتب کی خریداری اب بھی جاری ہے کیونکہ ان کا کوئی الیکٹرونک نعم البدل نہیں مگر جیسے ہی کوئی کتاب میں ایک بار پڑھ کر ختم کر لیتا ہوں تو میں اسے اپنے پاس نہیں رکھتا آگے جانے دیتا ہوں یعنی کسی اور کو دے دیتا ہوں یا پھر کسی پبلک لائبریری میں جمع کرا دیتا ہوں۔ اس کے پیچھے میری نیت جنگلات کا بچاؤ یا اپنی سخاوت کا مظاہرہ کرنا نہیں؛ میں تو صرف اس بات کا قائل ہوں کہ ہر کتاب کا ایک سفر ہوا کرتا ہے جو اس کو طے کرنا ہوتا ہے، اس لیے ان کو شیلف/الماری کی زینت بنانا کوئی اچھی بات نہیں۔

ایک لکھاری ہونے اور شاہانہ زندگی بسر کرنے کے ناطے، جو کہ میں واقعی بسر کیا کرتا ہوں، میں شاید اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہوں کیونکہ جتنی زیادہ کتابیں خریدی جائیں گی میری آمدن بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ مگر یہ قارئین کے ساتھ ناانصافی ہو گی خصوصاً ان ممالک میں جہاں کتب خانوں میں کتابیں خریدنے کے لیے حکومتی بجٹ کا ایک بڑا حصہ واضح طور پر دو بنیادی معیاروں یعنی کتاب کے مطالعے سے حاصل ہونے والی لطافت اور تحریر کے معیار پر مبنی نہیں ہوتا۔ آیئے ہم اپنی کتابوں کو سفر کرنے کے لیے آزاد کر دیں تا کہ وہ دوسرے ہاتھوں سے محسوس کی جائیں اور دوسروں کی آنکھوں کو محظوظ کریں۔ وقتِ تحریر میرے ذہن میں جارج لوئس بورخیس (Jorge Luis Borges) کی نظم کا مبہم سا خاکہ ہے جس میں ان کتب کا ذکر ہے جن کو پہلی مرتبہ کے بعد دوبارہ کبھی نہیں کھولا گیا۔

ابھی میں کہاں ہوں؟ فرانس کے ایک چھوٹے سے پائرینیئن (Pyrenean) قصبے کے ایک کیفے میں بیٹھا ٹھنڈی ہوا (ایئر کنڈیشنڈ) سے لطف اندوز ہو رہا ہوں کیونکہ باہر حرارت ناقابل برداشت ہے۔ میرے پاس گھر میں

بورخیس (Borges) کا مکمل کام موجود ہے۔ وہ ان ادیبوں میں سے ایک ہے جن کو میں مستقلاً اور بار بار پڑھتا ہوں لیکن کیوں نہ آج اپنے مفروضے کو آزمایا جائے۔

میں گلی عبور کر کے پانچ منٹ پیدل چل کر ایک اور کیفے میں داخل ہوتا ہوں جو کہ کمپیوٹرز سے لیس ہے۔ میں مالک سے علیک سلیک کے بعد ایک گلاس ٹھنڈے منرل واٹر کا آرڈر دے کر اپنی یادداشت کو کھنگالتا ہوں اور اُس نظم کا ایک مصرع مصنف کے نام کے ساتھ کمپیوٹر میں درج کرتا ہوں۔ دو منٹ سے کم وقت میں یہ نظم میرے سامنے ہوتی ہے۔

جو کتابیں میں آگے کسی اور کو دے چکا ان کے لیے مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا کہ میں انھیں اب دوبارہ کبھی نہیں کھول سکوں گا کیونکہ نئی اور دلچسپ کتابیں مسلسل شائع کی جا رہی ہیں اور میں کتابوں کے مطالعے کا شیدائی ہوں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ یہ ایک زبردست بات ہے کہ لوگوں کی ذاتی لائبریریاں ہونی چاہئیں؛ عموماً ایک بچے کا کتابوں سے پہلا واسطہ ان الفاظ وتصاویر سے بھرپور بنڈلوں کی حقیقت دریافت کرنے کے تجسس کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے یہ امر بھی اتنا ہی خوش کن ہے کہ جب کتابوں پر دستخط کرتے وقت ایک قاری میری ان کتابوں میں سے وہ کتاب ہاتھ میں دبائے میرے سامنے آتا ہے جو درجنوں مرتبہ ایک دوست سے دوسرے دوست تک منتقل ہوئی اس تک پہنچی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب نے بھی ایسے ہی سفر کیا ہے جیسے مصنف کے ذہن نے اس کتاب کو تحریر کرتے وقت کیا تھا۔

(محمد عاطف رشید ملک لمز کے طالب علم ہیں)

ریشم الیاس ڈار

نظم ''پہلی نظر میں محبت''

جان کلیئر کی نظم ''First Love'' سے ماخوذ

اُس ایک لمحے سے پہلے میں کبھی ایسا کھویا نہ تھا
جیسا کہ وہ احساس،
بہت اچانک و بے حد حسین
اُس کا دلفریب چہرہ
اِک دلکش پھول کی مانند کھلا تھا
اور جو میرا دل اُڑا لے گیا
پہلے میرا چہرہ سخت زرد ہوا
اور پھر میرے قدموں نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا
آہ! جب اُس نے مجھ پر نظر کی
نہیں معلوم کہ میرا کیا ہوا؟
یوں لگا جیسے میں، میری زندگی
اور سب کچھ ریزہ ریزہ ہو کر
بکھر گیا ہو
خون کی گردش میری رگوں میں تیز تر ہوئی

اور میں بینائی سے بھی محروم ہوا،
شاخیں، درخت، ہریالی،
یک دَم میرے چاروں اَور ہر شے بدل گئی،
جیسے بھری دوپہر آدھی رات کا منظر پیش کرنے لگے
میں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ رہا
لفظ میری آنکھوں سے یوں رواں ہوئے
جیسے تاروں سے سُر نکلے

کیا پھول ہی جاڑے کا انتخاب ہیں؟
کیا محبت کا بستر ہمیشہ سے برف ہی ہے؟
مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے بے صدا لفظوں کو سُن رہی ہو
پیار اظہار کا محتاج نہیں
میں نے ایسا دلنشین چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا
جو وہ اُس وقت میرے رُوبرو تھا
پھر میرا دل اپنے مسکن سے روانہ ہوا
اور کبھی لوٹ کر نہیں آیا

(ریشم الیاس ڈار لمز کی طالب علم ہیں)

محمد خان

نخشناس گلاب
(غنی خان کی پشتو نظم سے ماخوذ)

ایک دن، ایک صحرا میں شکار پہ تھا میں رواں
ایک گلاب کو کھڑے دیکھا، پرنور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ،
میں خفا خفا اس کے پاس گیا اور کہا،
آہ! میری طرح
کیا تم بھی ہو بدنصیب گل، کھوئے اپنے جاناں کے خیال سے
نہ کسی کے نازک ہاتھ تمھیں چہرے کے قریب لے جائیں
نہ تمھیں چومے کوئی نرم و نازک ہونٹ سے

وہ خاموشی کے ساتھ مسکرایا اور کہا" خان!
میں یہ صحرا نہ دوں، ایران کے گلستان کے بدلے،
میں یہاں ایک اکیلا وہاں ہزاروں میری طرح
یہاں چاروں طرف کمبخت ریت اور میں اکیلا، انوکھا

یہاں اس کالے ریگستان میں میں ایک شعلۂ نور
خوبصورت خاموش کرشمہ آسمان کا
تمھارے باغ میں ہزاروں گلاب میری طرح
ایک بے نام سرخ دریامیں ایک بے نام قطرہ رواں
تم بھی اپنے صحرامیں خفانہ ہو
آخرآجائے گادیدار کے لیے
کوئی سوختہ علی خان

پاگل پن

از

غنی خان

اے احمقوں کے سردار! نماز بہتر ہے یا مستی بہتر
حسن بننا بہتر ہے یا حسن پرستی بہتر
بہتر ہے، مستی بہتر ہے لیکن اس کے لیے دل آئینے کی طرح پاک چاہیے
اس دریا کو نگلنے کے لیے سمندر کا جذبہ چاہیے
حسن بننا بندے کے عشق کا کمال ہے
غم کے کالے دریا میں خمار جدائی کا ہے
تو اے میرے بچے! جاناں کی محبت اور بھی بہتر ہے
خوبصورت نام اور بھی بہتر ہے جلوۂ رنگین اُس سے بھی بہتر ہے

اے پاگلوں کے سردار! حسن بہتر ہے یا وفا بہتر
مجنوں بننا بہتر ہے یا لیلیٰ بننا بہتر
کہتے ہیں اے میرے بچے! دلبر کے منہ سے ہوا بہتر ہے
ٹھنڈا اور نرمی بہتر ہے اور گرم و تیز اور بھی بہتر ہے
یار کے چہرے پر دوپٹہ لال بھی اچھا ہے
پیلا بھی اچھا ہے، کالا بھی اچھا ہے اور سفید بھی اچھا ہے
تو اے میرے بچے! حسن بھی بہتر ہے اور وفا بھی بہتر ہے

مجنوں بننا بھی بہتر ہے لیلیٰ بننا بھی بہتر
فقیری بہتر ہے سرداریا مال دنیا بہتر
صنوبر کا پھول بہتر یا محبوب کا قلعہ بہتر
اے میرے بچے! شاہین کے لیے پربت کی چوٹی بہتر
گلاب کے لیے صنوبر بہتر ہے اور صنوبر کے لیے گلاب بہتر ہے

(محمد خان لمز کے طالب علم ہیں)

وکش اویس

غزل

وہ بادل کہاں اس کا سایہ کہاں ہے
یہ گرمی کا سورج ابھی تک یہاں ہے
کدھر کھو گیا ہے نہ جانے وہ رستہ
وہی جس پہ میرا شکستہ مکاں ہے
وہ نغمہ تو جنگل میں بکھرا ہوا ہے
وہی جس کے دم سے یہ بن بھی جواں ہے
میسر نہیں آج فصلوں کو پانی
کہ بارش بھی جانے کدھر کو رواں ہے
میں کب کا سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں
نہ منزل، نہ منزل کا کوئی نشاں ہے

(وکش اویس لمز کے طالب علم ہیں)

اسداللہ خان

میں اس کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں

میں اس کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں
اداس پتے، طویل صحرا، بدلتے موسم، بلکتے آنسو
میں اس کی آنکھوں سے جھانکتا ہوں
کھنڈر ہے کوئی، مکاں کے اندر
کہ جس کے دیوار و در کا روغن
تڑپ تڑپ کر اکھڑ رہا ہے
فضا کی خاموش سسکیوں میں
اداس پنچھی بلک رہے ہیں
نفس کی گرمی سے ہر کنارا
جھلس رہا ہے، بکھر رہا ہے
مگر یہ سوکھا گلاب دیکھو
سنو کہ اس کی ہر ایک پتی
الگ کہانی سنا رہی ہے
یہ چھت کے سینے سے لپٹے جالے

کہ جیسے ماضی کی ڈوریوں سے
کسی نے میرے خیال بُن کر
زماں کے دل میں پرو دیے ہوں
یہ جالے آتش نما دریچوں کے درمیاں سے لپک رہے ہیں
کہ جیسے صدیوں سے تشنہ ہونٹوں کی پیاس بجھنے کے منتظر ہوں
مگر یہ ممکن ہوا تو کیسے؟
میں اس کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں
تو اس کھنڈر میں ہے میرے ماضی کی داستاں کا یہ عکس کیسے؟
میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں
مگر یہ کیا ہے جو دیکھتا ہوں

(اسداللہ خان لمز کے طالب علم ہیں)

Shahama Sajid

Ustaad Daaman aur Faiz Ahmed Faiz

Saahil utton chukk ke maujan bhaavien kithay lay challan
Chal humaayon uthay chaliye maujan jithay lay challan
(Let the waves lift you offshore and carry you wherever they go
Let's take to wherever these waves are going to show)

As divine as these verses are, such was the depth in the soul of Chiragh Deen, more famously referred to, as Ustaad Daaman still known today as one of the most influential Punjabi writers in history. A poet and a mystic, Ustaad Daaman was a tailor by profession. He was among the most celebrated and praised Punjabi writers at the time of the Partition of British India in 1947. He was born in September 1911 and on the 3rd of December, 1984 he departed from this world to the next. He was buried in Lahore in the *chardivari* of a great sufi poet of the 16th century, Shah Husain.

His verse was first praised when in 1930 he stitched a suit for Mian Iftikharuddin, a famous political personality belonging to the illustrious *Arain* family who were the custodians of the Shalimar Gardens, Lahore. Mian Iftikharuddin invited Ustaad Daaman to recite his poem at a public meeting organized by the Indian National Congress. The poet became an instant hit because of the depth and the emotional endeavor of his words. Pandit Jawaharlal Nehru, one of the most prominent members of the Congress Party, was also present at the meeting. Inspired by Ustaad Daaman's words, Nehru dubbed him the 'Poet of Freedom'. In the poems that he initially penned, he referred to himself as *Humdam*. In his later works however, he switched to the name *Daaman*. The people present at these meetings conferred the title of 'Ustaad' to him due to his mastery in the field of poetry. He became a regular part of the Congress meetings as his words received more and more appreciation.

When talking about Punjabi poetics in the land of five rivers, Ustaad Daman's writings are one of the finest Punjabi literatures one can find. Many of the great writers from this era have recalled him for his unrivaled talent. When Ustaad Daaman passed away, Habib Jalib, a revolutionary leftist Pakistani poet, said 'Ustad Daman was a great nationalist. He represented faithfully the opinions and desires of the deprived folk. People cannot forget him.' Moreover, Faiz Ahmed Faiz, on being asked why he did not write poetry in Punjabi, replied that he could

not compete with the old masters of Punjabi like Sultan Bahu, Bulleh Shah, Waris Shah and others and the only one who could be ranked with them today was Ustaad Daaman. Ustaad's wisdom and humility was thoroughly reflected in his words. In an interview, Ustaad said that since his mother was a washerwoman, his mind remained clean and his father being a tailor implied that he could stitch torn fragments of life with patches of love.

The Province of Punjab, according to historians as well as philosophers was a region which suffered the most at the hands of partition of India. Ustaad Daaman believed that the unity of Hindus, Muslims and Sikhs was necessary if the struggle for freedom was to be carried on effectively. One example of his patriotic poetry is as follows:

'In China the Chinese are grand,
In Russia they do as they have planned.
In Japan its people rule over its strand.
The British rule the land of England,
The French hold the land of France,
In Teheran the Persians make their stand.
The Afghans hold on to their highland,
Turkmenistan's freedom bears the Turkmen's brand.
How very strange is indeed this fact,
that freedom in India is a contraband.'
(Translated by Sharma Fowpe, 2005)

Ustaad Daaman's struggle for freedom did not end with the British leaving India. He was not only a witness but also a victim of the tyrannies that hit the Indian land at the time of the creation of two distinct states, India and Pakistan. He wrote quite a few poems regarding the atrocities that took place during the time of partition. His words were insightful of his stance that he was not entirely supportive of the idea of the creation of a separate nation since it had lead to devastating consequences. In the rise of growing disputes between Muslims and non-Muslims, specifically the Hindus, he wrote:

Wahgay naal Attari di nai takkar
Na Geeta naal Quran di aey
Nai Kufr Islam da koi jhagra
Saari gall nafaa nuksaan di aey
(it is not the fight between Wahga or Attari
nor is it between Geeta and Quran
there is no war between Muslim and non-Muslim
all the matter is of benefit and loss)

During the havoc of partition, he lost his wife and child with whom he was reunited in Lahore but unfortunately, he lost them forever to a disease that he could not afford to get a treatment for. His friends pitched in the money for the burial of the deceased. As he was a supporter of the Congress and also wrote against the partition of India, he received great hatred and loathing at the hands of Muslim League supporters and other pro-partition groups. His poems were burnt and majority of his writings were destroyed. The ones from those times that survived were mostly recorded by his admirers. According to some sources, he later shifted to the veranda of the Shahi Mosque, where he lived the rest of his remaining life. Others talk about 'a tiny room below a mosque located in the midst of the in-famous Bazaar-e-Husn (Red-light area of Old Lahore)' (Jan). The room, which is now called Ustaad Daaman Academy and also referred as '*Ustaad Daaman ki Baithak*', is said to have played a huge role in the historical cultural scene of Lahore. The Academy is believed to be second to the Pak Tea House as a focal point for the intellectuals of the city.

Even after partition, he continued to write against the divide of India and political developments in Pakistan. During the early days of partition, Ustaad used to visit the *mushairas* in India, where he received a lot of appreciation and gratitude. Pandit Nehru even offered him to shift to India but he refused, saying that it was too difficult for him to move away from his motherland, where he was born. Moreover, his texts were reflective of his evasion from military dictatorships that had become a part of the Pakistani political scenario. He was arrested a few times due to his scrutiny of the government and politicians. Even Zulfiqar Ali Bhutto, known to be pro-democracy politician, issued an arrest warrant against the poet for writing against the latter's government and policies. But his importance as one of the most prominent Punjabi poets of the sub-continent cannot be undermined. He was, and will be, a gem in the world of Punjabi poetry.

Faiz Ahmed Faiz

Born on February 13, 1911 in the city of Sialkot, Faiz Ahmed Faiz is one of the most renowned intellectuals and writers the sub-continent has ever bred. He belonged to a wealthy, well-educated family; his father was a well-respected lawyer and shared his circle with intellectuals like Allama Iqbal and others. Faiz received his education from one of the finest institutions of his time. He studied Urdu, Persian and Arabic from the Scotch Mission High School. He further received a bachelor's degree in Arabic and a Master's degree in English from the government college in Lahore in 1932 and later he received another master's degree in Arabic from the Oriental College, Lahore, which helped him further to have a firm grip over the languages.

The poems that Faiz wrote in the early period had been light-hearted, romantic ones but while he was in Lahore completing his studies, he started to take interest in much serious topics such as of politics, community, and the much deeper connections between life and poetry. After his academic years, he took up teaching as a career in some of the most distinct colleges of India. During this time, he also entered into matrimony with Alys George, a British woman who was a convert to Islam, who bore him two daughters. In 1942, he joined the British Indian Army, but he resigned after few years. After partition he decided to stay in Pakistan, as it was his motherland. He was also among the intellectuals who were in support of the creation of a separate homeland for Muslims. Due to his intellectual capabilities, he became the editor of Pakistan Times, a socialist Pakistani Newspaper. Following the partition episode, he wrote a lot talking about the struggles the people faced during the freedom fight. According to some sources, Ustaad Daaman, the distinguished Punjabi poet was the mentor of Faiz. Such was the relation between Ustaad and Faiz that on his death on November 20, 1984, Ustaad despite his deteriorating health, came to shoulder Faiz's bier. The works of Ustad Daaman and of Faiz, both talk about some similar issues like the struggles the people of the region had to face due to partition, however, while Ustaad was resented to write about the atrocities people suffered due to religious and ethnic differences, Faiz's works talked more in light of the struggles faced by the people for independence. One of his poems that were praised not only in Pakistan but India post independence was "*Subh-e-Azaadi August '47*". Some of its verses are as follows:

Jigar ki aag, nazar ki umang, dil ki jalan

Kisi pe chaaraa-e-hijran ka kuch asar hi nahin
Kahaan se aayi nigaar-e-sabaa, kidhar ko gayi
Abhi charaagh-e-sar-e-rah ko kuch khabar hi nahin

Abhi garaani-e-shab mien kami nahin aayi
Najaat-e-deedaa-o-dil ki ghadi nahin aayi
Chale chalo keh who manzil abhi nahin aayi

(The antidote of severance
has had no effect on the burning heart,
on the longing of the waiting gaze,
on fires raging in the gut.
From whence did this zephyr
manifest itself, where did it zip past?
Even the lamps lining our streets
are hard pressed to know.

There has been no easing
of the full weight of night.
Parched eyes, aching hearts are yet
to find their moment of deliverance.
Walk on, walk on,
the home we seek has still to arrive.)

Faiz Ahmed Faiz, popularly known to be a leftist poet, however, was allegedly involved in the Rawalpindi Conspiracy Case of 1951. On March 9, 1951, Faiz was arrested with a group of some army officers under the Safety Act. These people allegedly attempted a coup d'état against the government of Prime Minister Liaqat Ali Khan, the most important of the reasons being the incompetence and corruption of the government and the handling of Kahmir Issue with India since the acceptance of the UN mediation by the government was seen by some, as a mistaken step. Faiz, along with the others, was set free after a punishment of four years of imprisonment.

Another time period when Faiz Ahmed Faiz had to face hardships for his publications was during the coup of Zia-Ul-Haq. Faiz settled in Karachi in around 1964. Here, he was appointed as a principal of the Abdullah Haroon College. He also simultaneously worked as an editor and writer for a number of notable newspapers

and magazines. A very significant role that he had to play was during Pakistan's 1965 war with India. He worked in an honorary capacity for the Department of Information, and wrote blatant poems of violence regarding the butchery between India and Pakistan, and what was later to become Bangladesh. But the power of his pen came to an end with the end of Zulfiqar Ali Bhutto. The Zia-Ul-Haq dictatorship forced Faiz into exile in Beirut, Lebanon. He nevertheless continued to write peoms in Urdu while in exile, which lasted till 1982. Two years after returning from exile, on the 20th of November 1984, Faiz passed away in Lahore at the age of 73. When talking about Faiz, one cannot simply go without making mention of the most famous of his poetry in romanticism. One such verse that has an impact of a lifetime is as follows:

jo rukay to koh-e-garan thay hum, jo chalay to jan se guzar gaye
raah-e-yaar hum ne qadam qadam, tujhe yaadgaar bana diya

(Shahama Sajid is a student of LUMS)

Works Cited

Dr. Naqvi. "Ustad Daman, Nationalist Punjabi Poet."*Pakistanprayersblogspot.com*. Pakistanprayersblogspot.com, 9 Apr. 2006. Web. 12 May 2016.

Hasan Zaheer (1998). The times and trial of the Rawalpindi conspiracy 1951: the first coup attempt in Pakistan. Oxford University Press. ISBN 978-0-19-577892-2.

Jan, Ammar Ali. "A Lost Legacy – Ustad Daman's Dera in Lahore."*Lahorenama.wordpress.com*. Lahore Nama, 12 Sept. 2008. Web. 12 May 2016.

Ramma, Safir. "West Punjabi Poetry." *West Punjabi Poetry: From Ustad Daman to Najm Hosain Syed* (n.d.): 215-28. Web.

"Faiz Ahmed Faiz- New Translations by Mustansir Dalvi: Faiz: Subh-e-aazaadi." *Faiz Ahmed Faiz- New Translations by Mustansir Dalvi: Faiz: Subh-e-aazaadi*. N.p., n.d. Web. 13 May 2016.

“Rawalpindi conspiracy case”. The Nation. 2009-08-27. Retrieved 2010-09-17.

https://www.poets.org/poetsorg/poet/faiz-ahmed-faiz